اشفاق احمد کے افسانوں میں تصورِ محبت

(تحقیقی وتنقیدی مطالعہ)

مقالہ برائے ایم ایس (اُردو)

مقالہ نگار:

بختر علی خان

رجسٹریشن نمبر:108-FLL/MSURDU/F13

نگران مقالہ:

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

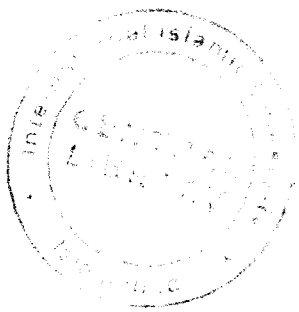

شعبہء اُردو

کلیہ زبان وادب

بین الاقوامی اسلامی، اسلام آباد

Acceptance by the *Viva Voce* Committee

Title of the thesis: اشفاق احمد کے افسانوں میں تصوریت (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

Name of student: Bakhtar Ali Khan

Registration No: 108/FLL/MSURDU/F13

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfilment of the requirements for the MS degree in Urdu.

Viva Voce Committee

Prof. Dr.Munawar Iqbal Ahmad
Dean
Faculty of Languages & Literature

Dr.Aziz Ibnul Hasan
Chairman
Department of Urdu

External Examiner
Dr. Naeem Mazhar
Associate Professor (Urdu)
NUML, Islamabad

Internal Examiner
Dr. Arshad Mahmood Asif
Assistant Professor (Urdu)
IIU,Islamabad

Dr. Syed Kamran Shah Kazmi
Assistant Professor
Supervisor

October 5, 2017

MS
891.4393
11غ
Acc # IH-21157

اردو ادب ۔ افسانہ

اشفاق احمد ۔ 2004-1925

تصدیق نامہ

اس امر کی تصدیق کی جاتی ہے کہ ایم فل اردو کے سکالر بختر علی خان نے تحقیقی مقالہ بعنوان ''اشفاق احمد کے افسانوں میں تصور محبت'' (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ) میری نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں سکالر کے تحقیقی کام سے مطمئن ہوں اور اس امر کی اجازت دیتا ہوں کہ مقالہ ھذا ایم فل (اردو) کی ڈگری کے حصول کے لیے جمع کروادیا جائے۔

ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

فہرست

موضوعات	صفحات
تصدیق نامہ	ii
پیش لفظ	۷
باب اول:	
ادب میں تصور محبت: بنیادی مباحث	۱
ا۔ تصور محبت: معروضی جائزہ	۲
ب۔ رومانوی تحریک میں تصور محبت اور افسانہ	۱۹
ج۔ حقیقت نگاری میں تصور محبت اور افسانہ	۲۹
حوالہ جات	۳۶
باب دوم:	
اشفاق احمد کے افسانوں میں شخصی محبت کا تصور	۳۹
ا۔ انسان سے محبت کا تصور	۴۰
ب۔ محبت، جنس اور جذبات نگاری	۴۹
ج۔ محبت کا روحانی تصور	۶۴
حوالہ جات	۷۲

باب سوم:

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف ۷۵

ا۔ محبت اور تصوف کا تعلق: اجمالی جائزہ ۷۶

ب۔ اردو افسانہ اور تصوف: ایک مطالعہ ۸۶

ج۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں تصوف کے ذاتی تجربات کی نوعیت ۹۳

د۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کا امتزاج ۹۹

حوالہ جات ۱۰۵

باب چہارم:

اشفاق احمد کے افسانوں میں سماج اور محبت ۱۰۹

ا۔ اشفاق احمد کے افسانوں میں سماج اور محبت کا باہمی تعلق: تجزیاتی مطالعہ ۱۱۰

ب۔ طبقاتی کشمکش ۱۲۸

ج۔ معاشرتی مسائل کا اظہار ۱۳۹

حوالہ جات ۱۴۵

مجموعی جائزہ ۱۴۹

کتابیات ۱۵۶

پیش لفظ

محبت نہایت بیش بہا فطری جذبہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ محبت ہی زندگی کی اساس اور محبت ہی وجود کا ثبات کا جوہر ہے۔ محبت ہی عبادت کی جان اور محبت ہی انسانوں کے باہمی تعلق کی بنیاد ہے اور محبت ہی اشیاء کے درمیان ربط کا ذریعہ ہے بلکہ آسمانوں اور زمین میں ہونے والی ہر حرکت محبت ہی کے سبب سے ہے۔ محبت ہی وجود کا راز ہے کیونکہ انسان کا اپنے پروردگار سے تعلق محبت کی بنیاد پر قائم ہے اور انسانوں کا اپنے گردوپیش کے ماحول سے ربط و تعلق بھی محبت ہی کی اساس پر استوار ہے۔ محبت ہی سے زندگی رواں دواں ہے کیونکہ کسی بھی کام سے محبت انسان مجبور کرتی ہے کہ وہ اسے خوبی اور خلوص سے سرانجام دے۔

اشفاق احمد متنوع الجہات شخصیت کے حامل افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ہدایت کار، صدا کار، کالم نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر سماجیات اور ماہر روحانیات بھی ہیں۔ ان کی تخلیقی شخصیت مصلح قوم کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی تمام تر علمی و ادبی خدمات کا مقصد عوام کی بھلائی اور معاشرے کی اصلاح اور باہمی محبت کی ترویج رہا ہے۔

ایم ایس کورس ورک کے دوران ہی کسی ایسے موضوع کی تلاش میں تھا جو میرے مزاج سے مطابقت رکھتا ہو۔ جناب اشفاق احمد اردو افسانوی ادب کا ایک بڑا نام ہے ان کی افسانہ نگاری کے متعلق معلومات حاصل کیں تو یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کے افسانوں میں تصور محبت کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اشفاق احمد پر ابتدائی تحقیق کے مراحل طے کر کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر طیب منیر (مرحوم) اور اپنے نگران ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کے مشورے سے ایک خاکہ تیار کیا جو خوش قسمتی سے منظور ہو گیا۔

زیر نظر مقالے کا عنوان ''اشفاق احمد کے افسانوں میں تصور محبت'' (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) ہے جس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں ادب میں تصورات محبت کے بنیادی مباحث کی وضاحت پیش کی گئی ہے اس باب میں محبت کے مختلف تصورات اور اردو افسانے میں تصور محبت کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

دوسرے باب میں اشفاق احمد کے افسانوں میں شخصی محبت کا فکری جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اشفاق احمد کے افسانوں میں شخصی محبت کی نوعیت اور انفرادیت پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کے تعلق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کا تعلق اردو افسانوں میں تصوف کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اشفاق احمد کے افسانوں میں سماج اور محبت کے حوالے سے ماحصل بحث مرقوم ہے۔

پانچواں باب حاصل بحث یعنی مجموعی جائزہ پر مشتمل ہے۔جس میں مقالے کے مختلف مباحث سے اخذ شدہ نتائج پر بحث کی گئی ہے۔

سب سے پہلے میں شکر گزار ہوں اس رب الرحیم کی مبارک ذات کا جس نے ہر لمحہ، ہر جاء میرے ہر کام میں میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔میری کامیابی اس کا کرم ہے۔میں اس کی رحمتوں کے در پر سر بسجود ہوں۔

زندگی مسلسل سفر کا نام ہے۔ایم ایس میں میرا داخلہ اور مقالے کی تکمیل زندگی کے خوبصورت سفر کا ایک حصہ ہے۔مقالے کی تکمیل کبھی نہ ہوتی اگر اس سفر میں میرے دوست واحباب اور اساتذہ کی محبتیں اور تعاون شامل حال نہ ہوتا۔میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کا لمحہ وہ تھا جب مجھے اپنی پسند کا موضوع اور نگران تفویض ہوئے۔

باپ کی شفقت ہر انسان کی زندگی میں سائباں کی سی حیثیت رکھتی ہے لیکن میرے لیے تو سائباں ہی میرے والد محترم کی ذات ہے۔میری تعلیم کے حصول میں نرسری سے لیکر ایم ایس کے سفر تک ان کے تعاون، مدد ،اعتماد اور حوصلہ افزائی نے ہمیشہ مجھے تقویت دی۔ان کا وجود میرے لیے باعث اطمینان ہے۔اسی طرح میری ''ماں '' کا وجود میری ہر تھکن کو سمیٹتا اور ان کی دعائیں میرے راہ میں پھول بکھیرتی ہیں۔جب بھی میں گھر سے باہر ہوتا ہوں اپنی ماں کی دعاؤں کے ہالے میں رہتا ہوں تبھی تو ہر قدم پر مجھے فرشتوں سے واسطہ رہتا ہے۔یہ سب میری ماں کی دعاؤں کا اثر ہے۔اپنے والدین کی تمام محنت ،ریاضت ،خدمت ،محبت اور عزت کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں۔

اساتذہ روحانی والدین بھی ہوتے ہیں اور پیغمبری بھی کرتے ہیں مجھے بھی ایسے ہی استاد ڈاکٹر سید کامران عباس کاظمی کے روپ میں ملے۔مقالے کے تمام رموز ونکات پر ان کی گہری نظر تھی۔اس مقالے کی تکمیل کے ہر مرحلے میں ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے لیے میں دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

سابقہ صدر شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ڈاکٹر طیب منیر مرحوم نے مجھے اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرماویں۔میں ان کا شکر گزار ہوں۔ساتھ ساتھ صدر شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ڈاکٹر عزیز ابن الحسن کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالے کی تکمیل کے دوران مشکل امور میں راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف پشاور ڈاکٹر سلمان علی کا دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بے پناہ مصروفیت کے باوجود مجھے وقت دیا اور مقالے کی مختلف موضوعات کے بارے میں مفید معلومات دیں۔ڈاکٹر عرفان اللہ خٹک اور اسسٹنٹ پروفیسر شوکت محمود کے مفید مشورے بھی مقالے کی تکمیل میں کام آئے ہیں ان کی معاونت میرے لیے حوصلے کا باعث بنی وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر وہاب اعجاز کی معاونت نے مقالے کے عنوان سے لے کر تکمیل تک پیش آنے والی ہر مشکل کو دور کیا ۔مواد کی فراہمی اور دستیابی میں خصوصی مدد فرمائی۔اگر ان کی طرف سے یہ سہولتیں مجھے نہ ملتیں تو شاید یہ مقالہ مکمل نہ ہوتا۔میں دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

میرے سب سے مخلص دوست اور کلاس فیلو محمد یوسف کا اگر میں شکریہ ادا نہ کروں تو یہ ان سے بڑی زیادتی ہوگی کیونکہ مقالے کے خاکے سے لے کر تکمیل تک انہوں نے میرا ساتھ دیا ان کا بہت بہت شکریہ۔سبجیکٹ سپیشلسٹ نیاز خان کا میں بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اشفاق احمد کے نایاب افسانوں کی فراہمی اور اشفاق احمد کے بارے میں مفید معلومات دیں۔

میں اس مقالے کی تکمیل میں اپنے دوست محمد آصف خان قریشی ،فداء اللہ خان اور شہزاد قیصر کی معاونت کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے بوقت ضرورت میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

فرحت الیاس نے اکادمی ادبیات اور مقتدرہ قومی زبان کی لائبریریوں سے کتب کی فراہمی میں میرا ہاتھ بٹھایا میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔بنوں پبلک لائبریری کے فرمان اللہ اور حافظ محمد کامران خان کے تعاون کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کتب کی فراہمی اور اخبارات ورسائل کی دستیابی میں مدد کی۔علی اکبر ناطق نے ٹیلی فونک رابطے کے ذریعے بعض مشکل اصطلاحات کو سمجھانے میں مدد کی ان کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔

آخر میں میں شکریہ ادا کرتا ہوں گل رحیم کا جنہوں نے اس مقالے کی کمپوزنگ کا کام تندہی اور محنت سے کیا ان کی تمام کاوشوں کے لیے ان کا شکریہ۔اپنی رفیقہء حیات سدرہ کا شکریہ باقی ہے،جس نے پڑھنے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا،کتب ورسائل کے انبار گوارا کئے اور گھر کی ذمہ داریوں سے کافی حد تک سبکدوش کئے رکھا۔

اپنی اس حقیر کاوش کی تکمیل کے سلسلے میں رب کائنات کا سر بسجود شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی مدد،فضل اور رضا کے بغیر دنیا کا کوئی کام مکمل نہیں ہوسکتا۔اس مقالے کی تکمیل میرے لیے خواب کی تعبیر سے کم نہیں اور بہت کم لوگوں کے خواب سچ ہوتے ہیں۔میں خوش نصیب ہوں کہ رب کریم نے مجھے ہمت اور حوصلے کے علاوہ اتنے شفیق والدین ،ہمدرد اساتذہ،تعاون کرنے والے احباب اور مخلص دوست عطا کیے جنہوں نے میرے ساتھ مل کر اس خواب کو تعبیر دی۔ان سب کا تہہ دل سے شکریہ۔

بختر علی خان

ایم ایس سکالر شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد

باب اول

ادب میں تصورِ محبت: بنیادی مباحث

(۱) تصورِ محبت: (معروضی جائزہ)

محبت انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ انسان نے جب سے اس دنیا میں قدم رکھا ہے محبت کا تصور بھی ساتھ لے کے آیا ہے۔ حضرت آدمؑ کے بیٹوں کا مشہور واقعہ اسلامی اور تاریخی کتب میں موجود ہے۔ ان بھائیوں میں ایک کے قاتل اور دوسرے کے مقتول بننے کا سبب بھی محبت کا جذبہ ہی تھا۔ گویا پورے واقعہ کا مرکزی نقطہ ،،محبت،، ہی ہے۔

انسان کے جسمانی اور روحانی ارتقاء کے مدارج کا غائر مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ حیوان کے برعکس انسان کو نہ صرف نسبتاً لمبے اور غیر محفوظ بچپن سے گزرنا پڑتا ہے بلکہ اسے اپنی جسمانی اور ذہنی ترقی کے مابین توازن کی کمی سے نبرد آزما ہونے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے۔ وہ یوں کہ انسان ذہنی طور پر تو جلد ہی اپنے ماحول کا ادراک کر لیتا ہے لیکن جسمانی تکمیل کی آہستہ روی کی باعث ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے کی تاب دیر تک نہیں لا سکتا۔

چنانچہ ایک نمایاں احساس کمتری جنم لیتا ہے جو بتدریج اس کے احساس تنہائی کا محرک بنتے چلا جاتا ہے۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ زندگی کے آغاز میں جب انسان کو ایسی ہی صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک احساس کم مائیگی و تنہائی اس پر مسلط ہو گیا تو وہ از خود ان قوانین اور حربوں کی طرف راغب ہوتا چلا گیا جن کے طفیل وہ اس غیر محفوظ صورت حال سے پیدا شدہ کمتری اور تنہائی کے احساسات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ ضرورت اس کے طبعی رجحانات کا جامے اوڑھ کر قبیلہ پسندی، قوت اظہار اور محبت کے احساسات کے صورت میں نمودار ہوئی جن کی مدد سے انسان، تہذیب و تمدن کی طویل شاہراہ پر گامزن ہوا۔

محبت کائنات کا ایک ایسا پہلو ہے جس کے بغیر کائنات کا تصور ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اس کائنات کو پیدا فرمایا ہے وہیں بہت سے جذبے اس دنیا کے باسیوں کو عطا کئے ہیں۔ محبت وہ نایاب، قیمتی اور پاکیزہ احساس ہے جو کائنات اور اس کے مظاہر کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہے۔

تصورِ محبت کے مختصر جائزے کے بعد اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ محبت کے معنی اور مفہوم کیا ہیں؟ محبت کیا ہے؟ اور محبت کسے کہتے ہیں؟ وغیرہ۔ ذیل میں اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی جائے گی۔ فیروز اللغات میں محبت کے لغوی معنی یہ ہیں۔ "الفت، پیار، چاہ، دوستی، یارانہ، عشق، لگن" (۱)

محبت کے معنی کشش کے ہیں یہ وہ جذبہ ہے جو بندہ کو خدا سے ملا دیتا ہے۔ حقیقی محبت اس وقت ملتی ہے جب فرد کسی کے ذاتی دکھ کو اپنا دکھ سمجھے، اس کی عزت کو اپنی عزت سمجھے۔ جب فرد کو کسی ذات سے حقیقی محبت ہو جاتی ہے تو وہ اسے محسوس کرنے لگتا ہے۔

محبت کیا ہے؟ یہ جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ آیا محبت کوئی خوش نما لفظ ہے یا کسی عمل کا ردعمل ہے۔ محبت دراصل معاشرتی معاہدے کا ایک جزو ہے جس پر عمل پیرا ہونے والے کامیاب کہلائے جاسکتے ہیں۔

محبت ایک وسیع تر روحانی احساس کا نام ہے جو کسی بھی فرد، کسی بھی رشتے اور کسی بھی چیز کے متعلق ہوسکتا ہے ۔ چنانچہ یاسر جواد محبت کی نفسیات کے دیباچے میں حسن اور محبت کا موازنہ کرتے ہوئے محبت کی تعریف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> حسن اور خوبصورتی کی بہت اہمیت ہے۔ خوبصورتی کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ اس جذبے کے مقابلہ میں بہت سطحی ہے جسے ہم محبت کہتے ہیں دوسروں کو اپنی روح اور شخصیت میں شریک بناتے ہوئے ان کی روح اور شخصیت میں شریک و معاون ہونے کا احساس ہی محبت ہے۔(۲)

اسی طرح محمد اقبال محبت کو وجدانی کیفیت قرار دیتے ہیں وہ محبت کے درجات بیان کرتے ہوئے ادنیٰ درجے کو میلان اور اعلیٰ درجے کو عشق کا نام دیتے ہیں چنانچہ وہ اپنی کتاب محبت میں لکھتے ہیں۔

> محبت ایک وجدانی کیفیت ہے اس کی حقیقت ادا کرنے سے انسانی دنیا کے الفاظ قاصر ہیں لیکن اس کا مادہ فطری طور پر ہر شخص میں موجود ہے۔۔۔ محبت کے ابتدائی درجہ کا ادراک ہر شخص کو حاصل ہے جس کو میلان کہتے ہیں اور اعلیٰ درجہ جس کو عشق کہتے ہیں اس کا ظہور کسی کسی میں ہوتا ہے مگر یہ دولت ہر انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے کیونکہ جب ہم محبت والوں کے قصے پڑھتے ہیں تو دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے۔(۳)

یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں کے دلوں میں بھی محبت کا مادہ موجود ہے کیونکہ ہر حسن اپنے ہم جنس کی طرف کشش اور میلان رکھتی ہے۔ البتہ اس جوہر نایاب کے ظہور کے درجات بے حد ہیں اور اس کے ظاہر ہونے کے مواقع یعنی جہاں یہ دولت سرسبز ہوکر ظاہر ہوتی ہے ان کے مراتب بھی لامتناہی ہیں لہذا محبت کا جو درجہ اور محبوب کا جو مرتبہ ہوگا اس کے مطابق محبت کے اثرات مرتب اور ثمرات ظاہر ہوں گے۔

محبت انوکھے انداز میں ایک چکر دار عمل ہے اپنی ذات کو وسعت دینا ایک ارتقائی عمل ہے۔ کوئی بھی فرد کامیابی کے ساتھ اپنی حدود کو وسعت دینے کے بعد وجود کی زیادہ بڑی منزل میں داخل ہوتا ہے لہذا محبت کرنے کا عمل خود کو فروغ دینے کا عمل ہے۔ چاہے اس کا مقصد کسی اور کی نشوونما ہی کیوں نہ ہو۔ تشکیل نو کے ذریعہ ہی انسان ترقی پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایم سکاٹ پیک لکھتے ہیں کہ:

محبت خود اپنی یا کسی دوسرے شخص کی روحانی نشوونما کو فروغ دینے کی غرض سے اپنی روح میں وسعت پیدا کرنے کی خواہش کا نام ہے۔ یہ ایک غایتی (مقصدی) تعریف ہے۔ طرز عمل کو اس کے مقصد یا غایت کے حوالے سے متعین کیا گیا ہے جو اس معاملے میں روحانی نشوونما ہے۔ (۴)

اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب مسرت کی تلاش میں محبت پر بحث کرتے ہوئے محبت کو دو مدارج میں بانٹتے ہیں وہ ان مدارج کو ''تلاش'' اور ''حصول'' کا نام دیتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

محبت کے دو مدارج ہیں ''تلاش اور حصول'' یہ دونوں مدارج انسان کو مسرت کے کیف زا لمحات بہم پہنچانے میں پیش پیش ہیں۔ محبوبہ کو حاصل کرنے کی تگ و دو اگرچہ مختصر ہوتی ہے اور بیشتر اوقات آنسوؤں اور سسکیوں کے تسلسل میں جاری رہتی ہے۔ تاہم اسے امیدوں اور آرزوؤں کی پریاں سنوارتی ہیں۔ دوسری طرف محبت کا اخری مقام جسے ,, حصول،، کہنا چاہیے سنگ بنیاد کا درجہ رکھتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اخر کار محبت اسی سنگ بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ تو یہ کوئی مبالغہ آمیز بات نہیں ہوگی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مرد نے حصول کو محض ,, جنسی میلاپ،، سمجھا ہے۔ (۵)

محبت کرنے اور چاہنے کی خواہش از خود پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ یہ فطری جذبہ ہے۔ انسان ایک سماجی جانور ہے اس لیے وہ جس ماحول میں رہ رہا ہوتا ہے خود کو اس ماحول میں جلد ڈھال لیتا ہے۔ ماہرین سماجیات نے انسان پر مختلف تجربات میں یہ ثابت کیا ہے کہ اگر انسان کو کسی جانور کی صحبت میں پرورش دی جائے تو وہ جانوروں کی طرح کے عادات واطوار اختیار کر لے گا۔ والدین کا اپنے بچوں سے پیار کا تصور، مذہب اور سماج سے جڑا ہوا ہے اس کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ جس کوکھ سے بچہ جنم لیتا ہے، اگر وہ قاعدے وقانون کے مطابق ازدواجی معاہدے کے تحت پیدا ہوا ہے تو وہ والدین کا جگر اور دل کا ٹکڑا ہوتا ہے لیکن یہ ,, ماں ،، جب دیکھتی ہے کہ اس کا ,, لخت جگر ،، کسی معاشرتی معاہدے کے برعکس نفسانی خواہشات کے تحت دنیا میں آیا ہے تو وہ اسے کچرے کے ڈھیر میں پھینک دیتی ہے۔ یتیم خانوں میں ڈال دیتی ہے۔ اگر ایک بچہ ازدواجی معاہدے اور دوسرا بچہ خواہش نفسانی کے تحت دنیا میں آیا ہو، تو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ یہاں محبت کا جذبہ، خونی رشتہ ہونے کے باوجود پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر بعض صورتوں میں ہو بھی تو سماجی جبر اسے ظاہر ہونے نہیں دیتا۔ سچی محبت کو ایثار، خوشی اور آرام کے ساتھ جوڑ کر انسان آسانی کی خواہش کو ترویج دیتا ہے۔ محبت کے جذبے کو خواہشات کے ہی تابع کر دینا حقیقی محبت کا تصور نہیں۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے ہمیں محبت کے معنی اور مفہوم سمجھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کی طرف رجوع کرنا پڑے گا کہ محبت کے اصلی معنی اور مفہوم کیا ہے۔؟ قران مجید میں اللہ تعالیٰ نے محبت کے لیے مختلف الفاظ کا ذکر کیا ہے۔ مولوی محبوب عالم نے اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں یوں لکھا ہے ,, قران مجید میں محبت کے لیے ,, ودّ

،حبّ اور محبۃ،، کے الفاظ آئے ہیں۔''(۶)

محبت کے سلسلے میں علماء میں اختلاف بھی رہا ہے بعض علماء نے لکھا ہے کہ محبت کے معنی ارادہ کے ہیں۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

> علماء نے محبت کا معنی بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ محبت ارادہ کی مترادف ہے جس کے معنی مائل ہونے کے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا بندوں سے محبت رکھنا اس کے ساتھ بخشش کا ارادہ کرنا ہے اور بندوں کا اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا اس کی اطاعت کا ارادہ کرنا ہے۔(۷)

علماء کی اصطلاح میں محبت کے معنی ارادہ کے ہیں، مگر صوفیائے کے ہاں محبت سے ارادہ مراد نہیں کیونکہ کسی انسان کے ارادہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوسکتا۔ ہاں البتہ اگر اللہ کے قرب حاصل کرنے اور اس کی تعظیم کرنے کا ارادہ مراد لیا جائے تو درست ہوسکتا ہے۔ تصوف کے انسائیکلو پیڈیا میں محبت کی تعریف کا ذکر یوں لکھا ہے۔

> محبت کی نہ تو کوئی ایسی تعریف کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی ایسی حد مقرر کی جاسکتی ہے جو لفظ محبت سے زیادہ واضح اور فہم کے زیادہ قریب ہو۔ کسی بحث کو شرح و بسیط سے بیان کرنے کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب اس میں کوئی اشکال ہو لیکن جب ابہام ہی اٹھ گیا تو بحث کی تشریح میں مبالغہ کرنے کی حاجت نہیں رہتی۔(۸)

دوسری جگہ تصوف کے انسائیکلو پیڈیا میں محبت کے معنی یوں ہیں:

> ،، لفظ محبت حب سے ماخوذ ہے، جو حبہ کی جمع ہے اور حبۃ القلب دل کا وہ مقام ہے جس پر دل کا دارومدار ہے لہذا محبت کا نام اپنے محل کے نام پر رکھا گیا ہے۔''(۹)

محبت کا مطلب اس قدر مبہم اور وسیع المطلب ہے کہ اس کا کوئی متعین مفہوم قائم کرنا ناممکن ہے، آقا کی کتے سے محبت اور کتے کی آقا سے محبت مشہور ہے۔ ماں کی بچہ سے محبت اور بچے کی ماں سے محبت، عاشق کی محبوب سے اور ایک بوالہوس کی حسن پرستی بھی محبت ہے۔ ایک صوفی کا خدا سے تعلق بھی محبت ہے۔ محبّ وطن کو وطن سے محبت ہے تو پھر محبت کا لفظ شرمندہ معنی کیونکر ہو۔ مقالات اجمل میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے۔

> ا۔ ابتلائے محبت اور ۲۔ محبت کرنا، ابتلائے محبت میں محبوب پر عاشق کے ان جذبات کا اضلال ہوتا ہے، جو اس نے اپنی شخصیت میں قبول نہیں کئے ہوتے۔ یہ ابتلا ذہنی مرض کی علامت ہے جس مرد نے اپنے اندر تصویر زن کو قبول نہیں کیا اس کے ساتھ ابتلائے محبت کا حادثہ پیش انا کسی قدر ناگزیر ہے۔ لیکن ابتلائے محبت ایک سلبی کیفیت ہے۔ اس میں مرد اپنی خود اختیاری، اپنی قوت ارادی کھو

دیتا ہے اور محبوب کا غلام بن جاتا ہے اس میں عزت نفس کا احساس نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ اس کیفیت میں رشک اور حسد کے جذبات طاری رہتے ہیں۔ محبوب نے کسی اور شخص سے بات کی یا اس کی طرف دیکھا تو جی جلنے لگتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ بات کہ مرد اپنے کام، اپنے فریضہ زندگی سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اس کے برعکس محبت کرنا عین انسانیت ہے۔ یہ جذبہ طوفان کی طرح نہیں آتا بلکہ محبت کی ایک مستقل اور دھیمی آنچ محبوب کو پہنچاتا رہتا ہے۔ اس جذبہ کی بدولت عاشق اور محبوب دونوں کی شخصیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ (۱۰)

محبت کے مختلف مفہوم ہیں۔ ذیل میں ان مفاہیم کا جائزہ لیا جار ہا ہے۔

(i) دینی مفہوم: ۔ فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محبت عبادت کا خلاصہ ہے اور عبودیت کا مغز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محبّ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے رسول حضرت محمدؐ کی پیروی کرے اور آپؐ کی پیروی اور اطاعت عبودیت کے بغیر ممکن نہیں۔ لفظ عبودیت انتہا درجے کی عاجزی اور محبت کو کہا جاتا ہے، کیونکہ عربی میں قلب متیم اس دل کو کہا جاتا ہے جو محبوب کا غلام ہو۔ سمیر حلبی نے اپنی کتاب محبت کی حقیقت میں لکھا ہے۔

محبت کی ابتداء فراق اور دل لگی سے ہوتی ہے مگر انتہا با مقصد ہوتی ہے اور اس کی حقیقت اس قدر دقیق اور پیچیدہ ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی، درحقیقت یہ تجربے اور مشاہدے کی چیز ہے۔ دین و شریعت میں یہ کوئی بری چیز نہیں کیونکہ دل تو اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہوتے ہیں۔ (۱۱)

(ii) محبت کا متصوفانہ مفہوم: ۔ اس قسم کی محبت سے مراد اللہ تعالیٰ کی محبت ہے جس کے بارے میں علامہ شانی ؒ لکھتے ہیں:

اصل محبت ذات باری تعالیٰ کی محبت ہے جس میں کسی اور چیز کا شائبہ تک نہ ہو۔ یہی محبت تمام قسم کی محبتوں کی بنیاد ہے۔ دو اشخاص کے درمیان محبت یا تو اس لیے ہوتی ہے کہ ان میں خیالوں کی ہم آہنگی اور ذاتی مناسبت پائی جاتی ہے یا اس لیے کہ وہ دونوں کسی صفت، مرتبہ، حالت یا عمل میں مشترک ہیں۔ (۱۲)

چاہیے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کی رضامندی کے حصول اور اس کی اطاعت اور جنت میں داخلے کا ذریعہ بنے مگر بہت سے صوفیاء اس کے بجائے صرف محبت کو مقصود سمجھ بیٹھے اور محبت ہی انکی تمام کوششوں اور امیدوں کا مرکز بن گئی۔ اس طرح وہ اعمال سے دست بردار ہو گئے اور محبت کا دعویٰ ان کے لیے شریعت کی پابندیوں سے بھی فرار کا بہانہ بن گیا۔

(iii) محبت کا علمی مفہوم:۔ محبت کے علمی مفہوم کے حوالے سے فزیالوجی کے ماہرین نے محبت کی عجیب تفسیر وتوجیہہ بیان کی ہے۔ وہ محبت کو نفسیاتی تقاضا قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ محمد اقبال اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

> محبت ایک نفسیاتی تقاضا ہے جس کا تعلق چند جسمانی غدودوں سے ہے۔ یہ لوگ محبت کا تجزیہ ایک جسمانی عامل کے طور پر کرتے ہیں۔ اس نظریے کے قائل لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ فزیالوجی کے اصول انسان کے تمام روحانی مظاہر، مثلاً محبت، کراہت، خودی اور جذبہ غیرت کی بھرپور تشریح کرتے ہیں۔ (۱۳)

(iv) محبت کا معاشرتی مفہوم:۔ شہریت کے ماہرین کے نزدیک محبت ایک معاشرتی عمل ہے جو ہر شہری میں پایا جاتا ہے کیونکہ وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ یہ لوگ محبت کو ایک معاشرتی جذبہ سمجھتے ہیں جس پر انسانی آبادی کی بقا کا مدار ہے۔ وہ اسے ایسا معاشرتی عمل قرار دیتے ہیں جس میں ایک فرد جماعت کے سامنے سپر انداز ہوتا ہے، لہذا ان کے نزدیک محبت ایک حیوانی یا زیادہ سے زیادہ نفسیاتی جذبہ ہے جو علم الاحیاء یا علم النفس کے موضوع میں شامل ہے۔ اس کے متعلق سمیر حلبی لکھتے ہیں۔

> ان کے نزدیک محبت کا تعلق نکاح، نسب، وراثت، رشتے، خاندان اور اولاد وغیرہ سے ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے محبت کو صرف افزائش نسل اور نوع انسانی کی بقا کا ذریعہ شمار کیا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے یہ حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ ہر محبت کا انجام شادی ونکاح نہیں ہوتا۔ بسا اوقات محبت یک طرفہ ہوتی ہے جو اس معاشرتی مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔ (۱۴)

محبت ایک ازلی جذبہ ہے جس نے وقت اور حالات کے تحت بہت سی ارتقائی شکلیں اختیار کیں۔ کہیں اسے عشق حقیقی اور مجازی کی تفریق دی گئی، کہیں محض ہارمونز کا اتار چڑھاؤ کہہ کر برطرف کر دیا گیا، کہیں کسی مصور کا فن پارہ بنا تو کہیں کسی شاعر کی نوا لیکن اسرار خودی کی طرح محبت کے اسرار گہرائی میں جانے سے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔

محبت کا قدیم تصور مادری نظام سے وابستہ ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں ماں سردار خاندان ہوتی ہے۔ علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں۔ ''تمام املاک اسی کی تھیں، وہ قبیلے کی سردار تھی، بشریات کی زبان میں اسے مادری نظام کہتے ہیں۔'' (۱۵)

تمدن کی ابتداء میں مادری نظام تقریباً ہر معاشرے میں پایا جاتا تھا۔ باقاعدہ قسم کی شادی کے رواج سے پہلے تمام رشتے صرف ماں یا ماں کے رشتے داروں کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ قبیلے کے تمام انسان اپنی ماں یا ماں کے رشتے داروں کے ساتھ رہتے تھے۔ اور اسی کو اپنے خاندان کا محور سمجھتے تھے۔ سب اسی کا کہنا مان لیتے تھے۔ یہ اس لیے

بھی ہوتا تھا کیونکہ زمانہ قدیم کا مرد عورت کو اپنے سے برتر سمجھتا تھا۔عورت ماں بن کر خاندان اور قبیلے میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی تھی جو مرد کے لیے ممکن نہیں تھا۔اس لیے تمام قدیم مذاہب عالم کی ابتدائی شکلوں میں دیویوں کا رتبہ دیوتاؤں سے زیادہ اہم رہا۔مادرانہ نظام میں کثرت ازواج عورتوں کی ایک سے زیادہ شادیوں اور ایک عورت کے کئی شوہروں کی شکل میں پایا جاتا تھا۔عموماً جنوبی ہند کے قبیلوں میں اس کا رواج پایا جاتا تھا۔یہاں یا تو تمام بھائی ایک عورت سے شادی کر لیتے ہیں یا کئی غیر متعلق لوگ ایک عورت سے شادی کرتے ہیں اور رخصت ہو کر سسرال میں رہتے ہیں۔سلسلہ نسل عورت کی طرف چلتا ہے۔دولت اور جائیداد ماں سے بیٹی کی طرف منتقل ہوتی ہے کیونکہ آج مہذب سوسائٹی میں کئی شوہروں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ہندوستان اور دوسرے ممالک میں یہ رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔جہاں تک اقتدار کا سوال ہے تمام اقوام عالم میں رفتہ رفتہ انفرادیت بڑھتی جا رہی ہے اور خاندان کی فرد واحد پر گرفت کم ہوتی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ مہذب سماج میں عموماً پدری نظام رائج ہے جس کو آج کل آزادی نسواں کی انجمنیں اور افراد مسلسل چیلنج کر رہے ہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مادرانہ نظام عہد قدیم میں رائج تھا۔جس میں ملکیت، وراثت، نسبت، حقوق، اور فرائض سب کے سب ماں کے رشتے سے وابستہ ہوتے تھے اور تمام قبیلوں کو چلانے کی ذمہ داری عورتوں کے پاس ہوتی تھی۔قبیلوں میں اقتدار بھی عورت ہی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔قبیلوں کی سردار عورتیں ہوتی تھیں اور عورتوں کو ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوتی تھی۔اس لیے مرد کی پہچان اس کے باپ سے نہیں بلکہ ماں کے نام سے ہوتی تھی۔سماج میں عورتوں کا رتبہ مردوں کے مقابلہ میں اعلیٰ اور افضل سمجھا جاتا تھا۔اس لیے مذاہب میں دیوتاؤں کا رتبہ دیویوں کے مقابلہ میں کم تھا اور پوری کائنات کی تخلیق کا سہرا دیویوں کے سر تھا۔دیوتا دیویوں کے ماتحت ہوتے تھے۔ڈاکٹر مبارک علی نے اپنی کتاب تاریخ اور عورت میں مادرانہ نظام کے متعلق لکھا ہے۔

> ابتدائی زراعتی زمانہ میں عورت کی اس اہمیت کی وجہ سے مادرانہ معاشرہ قائم رہا اور عورتیں قبیلوں کی سربراہ تھیں، اور ان ہی کے نام سے نسل چلتی رہی۔اس کی وراثت اس کی لڑکیاں ہوتی تھیں اور چونکہ باپ کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا تھا اس لیے ماں کے ذریعہ ہی سے خاندانی سلسلہ چلتا تھا۔زمین اور مکان مشترکہ ملکیت ہوتے تھے۔معاشرہ میں بہن بھائی کا رشتہ مضبوط ہوتا تھا۔چونکہ شوہر دوسرے قبیلہ سے آتا تھا، اس لیے وہ اجنبی ہوتا تھا۔عورتیں کئی کئی شوہر رکھتی تھیں، ایک مرد کے ساتھ رہنے کی روایت نہیں تھی۔(۱۶)

مادرانہ نظام میں عورت نے ماں کی حیثیت سے قبیلے کی حفاظت کرنا اور اشیاء کو محفوظ کرنے کا کام کیا۔اس کے لیے عورت نے سینکڑوں ایجادات کیں مثلاً زبان و تحریر، زراعت، برتن و اوزار، زیورات اور لباس جیسی اہم

ایجادات کیں۔

مادرانہ نظام میں زر، زن وزمین کسی مرد کی ذاتی ملکیت نہ تھی اس لیے غلامی اور ذاتی وراثت کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔فرد سماج کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔اس لیے سماج کی ہر چیز پر اس کا حق برابر ہوتا تھا۔اس دور میں مذہبی عقائد اور روایات پر بھی عورت کا راج تھا۔ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں۔

> اس لیے اس دور میں جو مذہبی عقائد اور روایات پیدا ہوئیں ان میں بڑا درجہ دیویوں کا ہے۔یونانیوں کی بڑی دیوی ارٹیمز (Artemis) تھی جو بعد میں ڈیانا بن گئی اور عیسائیت میں اس نے مریم کی شکل اختیار کر لی۔(۱۷)

ہندوستان میں ہولی کا تہوار اس دور کی یاد ہے کہ جب عورت قبیلہ کی سردار ہوتی تھی اب وقت کی تبدیلی کی وجہ سے مردوں نے اس کی رسومات میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔مگر وہ مرد جو آگ کے گرد چلتا ہے،عورتوں کا لباس پہنتا ہے اسی طرح اور بہت سی رسموں میں مرد زنانہ لباس پہن کر قدیم روایات کو باقی رکھتا ہے۔ہندوستان میں درختوں کے کنج دیوی ماتا سے منسوب ہوتے تھے اور وہاں مردوں کا جانا منع تھا۔ستم ظریفی یہ ہے کہ اب وہاں عورتوں کا جانا منع ہے۔

جیسے جیسے نئی ایجادیں ہوتی رہیں ان کی وجہ سے معاشرہ کے دھانچہ میں تبدیلی آتی رہی اور عورت و مرد کے تعلقات بدلتے رہے مثلاً ابتدائی زمانہ میں عورت کھرپی سے زمین کھودتی تھی اور بیج بوتی تھی اور اس طرح زراعت پر اس کا قبضہ تھا۔مگر جب ہل ایجاد ہو گیا اور اسے جانوروں کے ذریعہ چلایا جانے لگا تو اس کے بعد فصلوں سے عورتوں کی یہ اجارہ داری ختم ہو گئی اور اس کے ساتھ مادری نظام کمزور ہوا، اور اس کا سماجی رتبہ بھی گھٹ گیا۔اس ضمن میں ڈاکٹر علی عباس رقم طراز ہیں:

> زرعی انقلاب کے نفوذ سے قدیم اشتمالی معاشرہ میں عورت کو جو مرکزی مقام حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور شخصی املاک کے رواج وقبول کے ساتھ عورت بھی مرد کی املاک بن کر رہ گئی۔غلامی اور جاگیرداری نظام معاشرہ میں عورت کی حالت زار وزبوں تھی مرد خود تو اپنی ہوا و ہوس کی تسکین کے لیے آزاد تھا لیکن اپنی زوجہ کو معمولی سی لغزش پر بھی قانوناً جان سے مار دینے کا مجاز تھا۔باندی اور فحبہ کی صورت میں عورت کا نہایت بے رحمی اور ڈھٹائی کے ساتھ استحصال کیا گیا۔لڑائیوں کے دوران میں مفتوحہ اقوام کی ہزاروں بہو بیٹیوں کو باندیاں بنا کر حرم سراؤں کی زینت بنا لیا جاتا تھا یا انہیں سر بازار بھیڑ بکریوں کی طرح نیلام کر دیتے تھے۔سلاطین اور امراء کی حرم سراؤں میں خواجہ

سراؤں کا کڑا پہرہ ہوتا تھا۔ان باندیوں میں چند ایک ہی اپنے آقا کی خلوت میں بازیاب ہوتی تھیں۔اس بے بسی کے عالم میں اگر کوئی باندی کسی سے معاشقہ کرتی تو اس کی گردن ماردی جاتی تھی۔(۱۸)

عورتوں کی اس گرتی ہوئی سماجی حالات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہوا کہ معاشی وجوہات کی وجہ سے کم آمدنی سے تعلق رکھنے والے طبقوں میں یا تو دیر سے شادی ہوتی تھی اور یا وہ شادی کرنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔اس کی وجہ سے غیر شادی شدہ عورتوں اور مردوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔چونکہ عورتیں ان کی پہنچ سے دور ہوگئیں اس لیے ان میں اس پر غم وغصہ پیدا ہوا اور وہ عورتوں کے خلاف ہوگئے۔مردوں کا یہ غم وغصہ خصوصی طور پر ان عورتوں کے خلاف تھا کہ جو ان کے اثر سے دور تھیں جیسے کنواری، بیوہ، مطلقہ اور بوڑھی عورتیں۔اس لیے ان کے خلاف مہم چلادی گئی تا کہ ایسی کوئی مثال نہ رہے کہ جس میں مرد کی برتری کو چیلنج کیا گیا ہو۔

محبت کا جدید تصور پدری نظام سے شروع ہوتا ہے۔پدری اقتدار یا پدری نظام سے مراد پدری خاندان یا سماج میں پایا جانے والا نظام ہے۔جس میں مرد کو اپنے خاندان پر اختیار حاصل ہوتا ہے۔رشتہ داری یا قرابت داری نظام میں جدید کے مقابلہ میں جیسے جیسے ہم پچھلے سماجوں کی طرف جائیں، پدری نظام اس کی بہترین مثال ہے۔یہ مردوں کی برتری اور بالادستی کا ایک ثبوت ہے۔کچھ عرصہ پہلے تک ہندو راجا اور مسلمان نوابین اپنے اپنے حرم رکھتے تھے اور اپنی کنیزوں کی تعداد کو اپنی حیثیت سے جوڑتے تھے۔قدیم کتابوں میں پرانے ہندو سماج میں ایک با حیثیت مرد کے لیے ,, مہیشی ،، خاص بیوی کا ذکر ملتا ہے۔پدری نظام میں عورتوں کی حیثیت مردوں کا دل بہلانے والی یا گھر کا کام کرنے والی خادمہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔اس نظام میں تمام اختیارات اور جائیداد وغیرہ پر پورا حق کسی کنبے کے مردوں کا ہوتا ہے۔عموماً خاندان کا بزرگ مرد کنبہ کا مکھیا سمجھا جاتا ہے۔یہ نظام تقریباً تمام مہذب سماجوں میں پایا جاتا ہے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مادرانہ نظام کے زوال پر ایک نیا نظام وجود میں آیا جسے تاریخ نے پدری نظام کا نام دیا۔سماج میں پدری نظام کے آتے ہی عورت کا وہ مقام ختم ہوا جو قدیم زمانے میں اسے حاصل تھا۔مطلب یہ کہ ایک طویل تاریخی عمل کے نتیجے میں مادری نظام کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔جیسے جیسے جسمانی طاقت وقوت کا استعمال بڑھتا چلا گیا۔ایسے ایسے مرد کی برتری قائم ہوتی چلی گئی اور عورت کا سماجی مرتبہ گرتا چلا گیا۔ڈاکٹر مبارک علی نے اینگلز کے حوالے سے اپنی کتاب تاریخ اور عورت میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :

اینگلز نے اپنی کتاب ''خاندان، نجی ملکیت اور ریاست'' میں اس پورے عمل کی بڑے عالمانہ انداز میں وضاحت کی ہے کہ کس طرح سے ان تبدیلیوں کے نتیجے میں انسانی تہذیب وتمدن، روایات

اور ادارے مرد کے تابع ہو گئے اور نجی ملکیت نے عورت کی آزادی اور خود مختار کو ختم کر دیا اور وہ بھی بالاخر نجی ملکیت کا ایک حصہ بن کر رہ گئی، اس کی سب سے پہلی نشانی تو یہ تھی کہ عورت صرف ایک مرد کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی۔ جب کہ مرد کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ کئی بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ خاندان کے اندر مرد کی حکمرانی ہو اور وہ بچے پیدا ہوں جو صرف اس کے نطفے سے ہوں تا کہ وہ اس کے وارث بن سکیں۔ اینگلز لکھتا ہے کہ،، تاریخ میں یک زوجگی نہ تو مرد اور عورت کی مصالحت کا نتیجہ تھی اور نہ شادی کی اعلیٰ شکل۔ اس کے برعکس وہ عورتوں پر مردوں کے تسلط کا اظہار تھا۔ (۱۹)

پدرانہ نظام میں عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے صرف محروم ہی نہیں کیا گیا بلکہ عورتوں کا تاریخی کردار تاریخ کے صفحات سے بھی غائب کر دیا گیا اور مادرانہ نظام کی ایجادات کا سہرا پدری نظام کے سر باندھ دیا گیا۔ اس طرح دنیا سے ہمیشہ کے لیے مادرانہ نظام کا خاتمہ ہوا اور پدری نظام کی بالادستی قائم ہوئی اور عورت ہمشہ کے لیے مرد کی غلام بن گئی۔

جب زمین کو ذاتی ملکیت بنانے کا عمل شروع ہوا تو اس سے وراثت کی سوچ پیدا ہوئی اور وراثتی نسل کو خالص رکھنے کے لیے عورتوں کو غلام بنا لیا گیا۔ مردوں نے مادرانہ نظام پر پدری نظام کی بالادستی قائم کرنے کے لیے مذاہب میں دیویوں کے درجات کم کر کے دیوتاؤں کو آسمان کا مالک بنا دیا اور آسمانی اخلاقیات کا سہارا لے کر عورتوں کو ذہنی غلام بنانے کی کوشش کی اور خود کو مجازی خدا بنا کر عورت کا مالک بن گیا۔

پدرانہ معاشرہ برابری کے بجائے فوقیت اور امریت کو ترجیح دیتا ہے۔ مادرانہ اور پدرانہ نظام نے جن روایات کو فروغ دیا وہ یہ تھیں۔

مادرانہ نظام میں انسانی مساوات، زندگی کا تقدس، انسان دوستی، روشن خیالی، جمہوریت و اشتراکیت تھیں، تو اس میں فطرت کا سب کے لیے حصہ تھا۔ جب کہ پدرانہ معاشرہ امریت، مطلق لعنانیت، فاشزم اور انفرادیت پرستی کو فروغ ہوا۔ اس میں ذہنیت کی جڑیں گہری ہوئیں کہ جس فرد کا تعلق قبیلہ یا برادری سے نہ ہوا اس کو شک و شبہ اور نفرت سے دیکھا جائے۔ ان جذبات نے قوم پرستی اور نسل پرستی کو پیدا کیا۔

قرون وسطی میں مرد نے اپنی برتری قائم کرنے کے بعد عورت کو پس ماندہ بنانے کے لیے تین طریقوں کو اختیار کیا۔

۱۔ عورتوں سے تمام اختیارات چھین لیے جائیں۔ خصوصیت سے عورتوں کو جو جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے بارے

میں معلومات ہیں۔ان سے انہیں محروم کردیا جائے۔اس لیے یورپ میں جادوگرنیوں کے خلاف جوتحریک اٹھی وہ اس کا ایک حصہ تھی۔

۲ ۔عورتوں کومختلف پیشوں سے نکالا جائے،اوران میں مردوں کوداخل کرکے ان کی برتری قائم کی جائے۔

۳ ۔عورتوں کواب تک فطرت کا ایک حصہ سمجھا جاتا رہا تھا،اس لیے ان کی مخالفت بھی اس طرح کی گئی جیسے فطرت کی۔

یورپ میں تحریک نشاۃ ثانیہ میں نئے نئے نظریات اورتحریکیں اٹھیں مگران سب میں سے کسی نے عورت کے سماجی مقام کواونچانہیں کیا۔ہیومن ازم (انسان دوستی) کی تحریک نے بھی مردکودریافت کیا،ٹامس مور کی یوٹو پیا میں بیوی شوہر کے ماتحت ہے۔تحریک اصلاح مذہب میں عورت مزید سماجی طور پر پس ماندہ ہوگئی یہاں تک کہ اسے سماجی کاموں سے بھی روک دیا گیا،وہ صرف خانقاہوں میں رہ کرعبادت کرسکتی تھیں،مگروہاں بھی حکم مردوں کا چلتا تھا ۔

باقی دنیا کی طرح ہندوستان میں بھی مادرانہ نظام اچانک ختم نہیں ہوا، بلکہ کچھ علاقوں میں ختم ہوااور کچھ میں باقی رہا۔اس لیے ان علاقوں میں جہاں پدرانہ نظام قائم ہوگیا،انہوں نے مادرانہ نظام کوحقارت سے دیکھااوران کے رسم ورواج کواخلاق سے بری قراردیتے ہوئے اسے فحش اوربے حیائی کا نام دیااورعورت پرخصوصیات کے ساتھ بڑے طنز کیے۔

محبت نہایت بیش بہا فطری جذبہ ہے۔یہ جذبہ دبایا بھی جاسکتا ہے اس کا رخ بھی موڑا جاسکتا ہے مگراسے فنا نہیں کیا جاسکتا،اس لیے اس جذبے کومہذب بنانا نہایت ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ جذبہ اس لیے ودیعت فرمایا تاکہ انسان کی زندگی کے اندھیرے محبت کی روشنی میں چھپ جائیں۔وہ زمانے اورزندگی کے طوفان میں ثابت قدم رہےاوراپنے فرائض عظمیہ دلجمعی اورخوش اسلوبی سے انجام دے سکے۔اللہ تعالیٰ کا بہت بڑااحسان ہے کہ اس نے انسان کے لیے خوداپنی ہی ذات عالیٰ کومرکزمحبت ٹھرالیااوراعلان فرمایا۔''**یحبھم ویحبونہ**،،ترجمہ:اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے،وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں(۲۰)

دوسری جگہ قران پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''وھوالغفورالودود :ترجمہ وہ بے حد بخشنے والااورکمال محبت کرنے والا ہے،،(۲۱)

محبت کارواج ثقافت کی دین ہے۔خدا سے محبت سے لے کرانسان سے محبت تک،جانوروں سے لے کر مٹی سے محبت تک جنسی عمل جاندار کی جبلت ہےاورکشش ولگاؤ صفت،جبلت اورصفت مل کراس سبق پرعمل پیرا ہونے کا وصف بنتا ہے جس کی تبلیغ وتشہیر میں سارے ہی ذرائع،سماج سے ابلاغ تک،شعوری طور پر ہمہ تن مصروف

ہیں۔

ماہرین نفسیات محبت میں مبتلا ہونے کے ضمن میں دو نکات کا خصوصی ذکر کرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اگر انسان نفسیات کے حوالے سے مختلف نہ ہوتے جس طرح جانور جبلت اور ضرورت کے تحت ایک سے ہوتے ہیں تو کوئی بھی شخص کسی دوسرے شخص سے محبت نہ کرسکتا۔دوسرا نکتہ یہ ہے کہ محبت اصل ہیں نفرت کا عکس معکوس ہے۔محبت سے پہلے نفرت کا ہونا ضروری ہے۔ ہر انسان اصل میں نامکمل ہے۔دوسرے شخص میں اپنی شخصیت کے معدوم اجزاء یا صفات کو دیکھ کر حسد کا جذبہ سر اٹھاتا ہے اور اگر اس شخص تک رسائی ہو جائے تو حسد رشک میں ڈھل کر ان صفات کے آگے سر جھکا دیتا ہے۔پھر محبت پر اکتفا کر کے اپنی ذات کی تکمیل کا نہ پورا ہونے والا خواب دیکھنے لگ جاتا ہے۔اپنی ذات کے بارے میں عدم اطمینانی، نامکمل ہونے کا شعور، تنہائی کا احساس اور ضرورت کی خواہش یہ سب مل کر محبت کے سراب کی رغبت کا باعث بنتے ہیں۔اکثر لوگوں میں یہ بے چینی لاشعوری ہوتی ہے مگر بعض لوگوں میں اس کا شعور معمولی اضطراب، جوہڑ کی سی ساکت بے اطمینانی یا بلاوجہ پریشان ہونے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہ ان مطالبوں کو پورا نہ کرنے کی پیشمانی ہوتی ہے جن کا تقاضا انسان کی ذات خود سے کرتی ہے۔اپنے آپ کو یا دوسروں کو اس بارے میں چاہے جو بھی جواز پیش کیے جائیں لیکن یہ کیفیت اصل میں ذاتی نااہلیت یا ذاتی ناکافی پن کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔

جذبہ اردو میں عربی سے ماخوذ لفظ ہے جس کے معنی کشش، کھنچاؤ کے ہیں۔جذبات جمع ہے جذبہ کی اور جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب بیرونی عوامل انسانی شعور کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔اس کو ہم ایک مثال سے واضح کر دیتے ہیں مثلاً عشق ایک جذبہ ہے۔یہ اس وقت تک اپنا صحیح اثر نہیں دکھا سکتا جب تک کہ یہ انسانی شعور کو اپنے اندر جذب نہ کر لے، جذبات کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ قواعد و قوانین کا تعلق انسانی شعور سے ہے جبکہ جذبات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے۔جب تک کہ یہ انسانی شعور کو اپنے اندر جذب نہ کر لیں۔جذبات بہت کم مواقع پر سودمند ثابت ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر اہل دانش عموماً جذبات سے پرہیز ہی کرتے ہیں۔

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ادبی نقطہ نظر سے جذبات کو دو حصوں میں بانٹا گیا ہے۔

> اساسی جذبات اور تبعی جذبات۔جذبات اساسی سے مراد وہ جذبات ہیں جن کی تحلیل کسی دوسرے جذبے میں نہیں ہو سکتی، جو کسی دوسرے جذبے سے ماخوذ نہیں ہوتے۔یہ انسان اور حیوان میں مشترک ہیں اور جذبات تبعی سے مراد وہ جذبات ہیں جو تحلیل ہو کر جذبات اساسی پر ٹھہرتے ہیں اور انہی سے ماخوذ و مرکب ہوتے ہیں۔یہ جذبات عموماً انسان کے ساتھ مختص ہوتے ہیں۔اساسی جذبات انسان کی ابتدائے عمر میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔غم

> ومسرت ۔لذت والم ،جب جذبات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں تو غم وحسرت کہلاتے ہیں ۔خوف ،غضب ،الفت ،انا نیت اور شہوت اساسی جذبات ہیں ۔رشک ،حسد ،شرم ، مامتا ،حیا، عشق ،تعظیم ،ایثار ،مذہبیت ،حب وطن اور جمال پسندی وغیرہ تبعی جذبات ہیں جو اساسی جذبات سے ماخوذ ومرکب ہوتے ہیں ۔(۲۲)

ہمارے سماج میں جہاں اجتماعی نقطہ نظر سے محبت کی مذمت کی جاتی ہے ،وہاں روشن خیال نوجوانوں کے ذہن میں محبت کو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل ہے ۔محبت کو جو یہ غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اس کا مقام ان اخلاقی اقدار کا سا ہے ،جن کا ذکر وفکر سے افراد ایک خاص اطمینان حاصل کرتے ہیں ۔عدل وانصاف ،حسن ،اخوت اور مروت ،ایسے الفاظ ہیں جن کو کہنے اور سننے سے ایک خاص حظ کا احساس ہوتا ہے ۔گویا جہاں ہم نے ان لفظوں کو زبان سے ادا کیا ۔اس ادائیگی کے فعل ہی میں ان پر عمل بھی ہو گیا اور ہماری ساری زندگی ان اقدار کے سانچے میں ڈھال گئی ۔ان لفظوں میں ایک ساحرانہ قوت ہے جو ہمیں ہماری اصل زندگی اور اس کی محرکات سے بے خبر کر دیتی ہے ۔محبت بھی ایک ایسا جذبہ ہے جو ہر اس کشش کو جو مرد عورت کے لیے محسوس کرتا ہے اور عورت مرد کے لیے ایک تقدس کی فضا بہم پہنچاتا ہے اور اس کشش کی شدت کو لوگ محبت کی شدت سمجھتے ہیں ۔

لفظوں کی اس ساحرانہ قوت کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب ہم کسی ادبی تخلیق میں مکمل یا صحت مند شخصیت کے خصائل کا بیان پڑھتے ہیں تو ہمیں ایک خاص تسکین حاصل ہوتی ہے ۔دراصل یہ تسکین ہماری شخصیت کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کی تسکین ہوتی ہے جو ہم اپنے متعلق باندھتے ہیں ۔اس تصور میں ہماری خواہشات ،ہمارے جذبات اور ہمارے عزائم یکجا ہوتے ہیں ۔اس بیان کو پڑھنے سے ہمیں یہ تسکین حاصل ہوتی ہے کہ جو ہم آہنگی اور یک سوئی ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ہمیں حاصل ہو چکی ہے ۔حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے ۔وہ امیر عورت جو تھیٹر میں مفلسوں کی حالت دیکھ کر زار وقطار آنسو بہاتی ہے اور ان آنسوؤں پر کسی قدر تفاخر محسوس کرتی ہے یہ بھول جاتی ہے کہ اس کا ڈرائیور باہر سردی میں اکڑ رہا ہے ۔

محبت سے مراد وہ جذبہ ہے جسے انسان اخلاقی نقطہ نظر سے مستحسن سمجھتے ہیں اور ہر اس کشش کو جو چاہے اس جذبے سے کوسوں دور ہو اور نوعیت میں بالکل مختلف ہو محبت کا نام دے کر مستحسن سمجھنے لگتے ہیں ۔

محبت اور جذبات کا آپس میں گہرا تعلق ہے کیونکہ محبت ہی سے جذبات پیدا ہوتے ہیں بلکہ محبت ہی جذبے کا مترادف نام ہے ۔جذبات کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد اجمل لکھتے ہیں ۔

مشاہدہ ہو یا ادراک ،فکر ہو یا عمل ،سائنس ان کی طرف توجہ کرنے سے نہیں گھبراتی ۔لیکن جونہی سائنس ،احساسات و جذبات کی طرف رجوع کرتی ہے ،فوراً ہی بوکھلا جاتی ہے اور کبھی تو انہیں شخصیت کی جان اور اصل الاصول سمجھنے لگتی ہے ،اور کبھی محض ایک محرک کہہ کر ٹال دیتی ہے ۔وہ ماہرین نفسیات جو روح اور مادہ کی کشمکش سے اس طرح نجات کرتے ہیں کہ مادیت کو اپنے نظام فکر کی بنیاد بنا دیتے ہیں ، جذبات کی اساس جسمانی تغیر کو سمجھنے لگتے ہیں ۔مثلاً ولیم جیمز نے کہا تھا کہ کسی جذبے کی جسمانی علامتیں پہلے ظہور میں آتی ہیں اور ذہنی علامتیں بعد میں ۔یہ نظریہ ہمارے روزمرہ کے نظریے کے بالکل برعکس ہے ۔ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں تو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں ۔ہم غصے میں آتے ہیں تو کسی نہ کسی کو چپت رسید کر دیتے ہیں ،لیکن ولیم جیمز نے کہا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ہم بھاگتے ہیں اس لیے ڈرتے ہیں چونکہ ہم چپت لگاتے ہیں اس لیے غصے میں آتے ہیں وغیرہ وغیرہ ۔(۲۳)

اردو ادب میں جذبات کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور اگر جذبات میں محبت کا عنصر زیادہ ہو تو جذبات زیادہ جاندار ہوتے ہیں کیونکہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا ۔اس سلسلے میں شاعر علی شاعر لکھتے ہیں:

اردو ادب میں جذبات کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور احساس کے وجود نے حساس طبع کو بھی زیادہ نمایاں کیا ہے ۔یہ بات سچ ہے کہ جذبات میں رومانیت کا عنصر ہو تو جذبات زیادہ جاندار ہوتے ہیں ۔اس لیے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے ہونے ،جس کے وجود سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے اردو ادب میں تخلیق کاروں کی شاعری اور نثر دونوں میں ایک ایسی سوچ کا رنگ بھرا ،جس نے پڑھنے والوں کے قلب و ذہن پر اپنا اثر اس طرح قائم کیا کہ پڑھنے والوں نے ہر کردار کو اپنے اندر جیتا جاگتا محسوس کیا ۔ان کرداروں کے احساس کو اپنے ماحول میں محسوس کیا ،اور اس کا احساس کیوں ہوتا تھا ؟اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والوں نے جیتے جاگتے لوگوں کے ماحول کا مشاہدہ کیا ،انسانوں کی عادات و اطوار کا مشاہدہ کیا اور پھر تخلیق کے ایسے رنگ میں اپنے ہنر و فن سے الفاظ کو ڈبویا کہ وہ چمک چمک کر اپنے ہونے کا پتا دینے لگے (۲۴)۔

جذبات کا مطالعہ خاصی مدت تک ماہرین نفسیات کا محبوب موضوع رہا ہے لیکن آہستہ آہستہ اب اس کا ذکر کم ہو رہا ہے ۔وہ محض اس لیے کہ اب پوری شخصیت کا مطالعہ زیادہ اہم سمجھا جانے لگا ہے ۔یعنی اب جذبات کو

مشاہدہ وادراک، سوجھ بوجھ تفکر وتعلیم کے ساتھ وابستہ کر کے ان کا مطالعہ ہوتا ہے۔ جذبات کے بارے میں ڈاکٹر محمد اجمل نے ایک خوبصورت مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> ایک مدرسہ فکر نے جذبات وتفکر کے باہمی تعلق کو نہایت اہم سمجھ رکھا ہے۔ یہ مدرسہ کہتا ہے کہ آپ کے زندگی کے متعلق مفروضوں کا جذبات پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ کا مفروضہ یہ ہے کہ جب کوئی آپ کو گالی دے تو اپ کو ایسی حالت میں بہت غصہ آئے گا۔ سو یہ مردانگی کے متعلق آپ کا مفروضہ ہے۔ آپ اس مفروضے کو یوں بھی بدل سکتے ہیں کہ اگر کوئی آپ کو گالی دے تو گالی دینے والے کو مجبور محض سمجھ کر معاف کر دیں گے۔ اگر یہ مفروضہ ہے تو غصہ نہیں آئے گا۔ (۲۵)

اصل بات یہ ہے کہ جذبہ ایک شرارے کی طرح ابھرتا ہے اور پھر راکھ ہو جاتا ہے۔ یہ محض خیال ہے یا مفروضہ ہے جو اسے کسی حد تک مستقل بنا دیتا ہے۔ اسی قسم کے اور تجربات، جذبات اور شخصیت کے باہمی تعلق کو اجاگر کر رہے ہیں۔ اس وسیلے سے جذبے کی نفسیات کو دوبارہ اہمیت حاصل ہو سکتی ہے۔

محبت جذبے کا دوسرا نام ہے۔ آگ، ہوا، پانی، زمین، ستارے کی طرح لاتعداد اجزاء ہیں جس میں زندگی نمو ہے لیکن اختیار کی صلاحیت نہ ہونے کے سبب محبت کے جذبے کو ان میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح جانوروں میں محبت کا جذبہ اختیاری نہیں بلکہ متعین ہے۔ صنف مخالف سے اپنی خواہشات کی تکمیل یا قدرت کے متعین کردہ اصولوں کو پورا کرنا محبت نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی طرح جانوروں کا انسانوں سے محبت کرنے کا کوئی تصور نہیں بلکہ یہ عادات ہیں جو انسان اپنے طریقوں سے تبدیل کرا دیتا ہے لہذا اس ضمن میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ محبت کا یہ جذبہ صرف انسانوں تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ہر زندہ چیز میں محبت کرنے اور چاہے جانے کی خواہش اور صلاحیت ہوتی ہے۔

محبت کرنے اور چاہنے کی خواہش از خود پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ جہاں زندگی کی نمو ہے وہاں فطرت کے دیگر تقاضوں کی طرح بنی نوع انسان کے علاوہ چرند، پرند، درخت، پانی، ہوا، آگ میں قدرت نے تقاضوں کو پابند کر دیا ہے کہ اسے چاہنے کی خواہش اور صلاحیت کیا معنی رکھتی ہے۔

آگ سے محبت رکھنے والا اس سے پرستش کی حد تک محبت وعقیدت رکھتا ہے لیکن آگ کی فطرت میں محبت نہیں بلکہ جلانا ہے۔ اسے خود سے محبت کرنے والے کے جذبات کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ آگ کے آگے ہاتھ جوڑنے والا جب آگ میں ہاتھ ڈالے گا تو اس کا انجام جلنا ہی نکلے گا۔ ہوا میں زندگی کی نمو ہے لیکن انسان کے چاہنے اور مسخر کرنے کے باوجود اس کی مقررہ فطرت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح پانی میں بھی زندگی کی نمو ہے لیکن چاہے جانے کی خواہش اس کی فطرت میں نہیں ہے۔ پانی کو ماں کا درجہ دینے والے، اگر پانی میں زیادہ سانس

روکیں تو نتیجہ موت ہے۔ یہاں تک تو ہم اس بات پر مقدم ہیں کہ محبت کا جذبہ انسان کی فطرت تک محدود ہے لیکن ہر زندہ چیز میں محبت کے جذبے اور صلاحیت کو متلاشی کرنا، ہونا ممکن نہیں ہے۔

محبت کائنات کا ایک ایسا پہلو ہے جس کے بغیر کائنات کا تصور ممکن نہیں۔ قدرت نے جہاں اس کائنات کو تخلیق دی ہے۔ وہی بہت سے جذبے اس دنیا کو سونپ دیئے ہیں۔ خوشی، غم، افسردگی اور کئی پہلو جنہوں نے کائنات کی خوبصورتی میں اپنا رنگ شامل کیا اور اس کی دلکشی کا سامان بخشا، وہی ایک عجیب، پاکیزہ اور نایاب احساس ,, محبت ،، کو بھی گوہر نایاب کی مانند اس دنیا کی رنگین اور دل موہ لینے احساسات کے درمیان نصب کیا۔ محبت وہ نایاب اور انمول پاکیزہ احساس ہے جو کائنات کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہے، جیسے سورج کی تابکار شعاعیں اگر چاہیں تو زمین کی رونقوں کی جلا کر بھسم کر دیں مگر یہ محبت ہی ہے جو سورج اپنی شعاعوں کو زمین کی احساسات کے مطابق برساتا ہے جس سے زمین کی رونقیں قائم رہتی ہے اور زمین اس کے محبت میں مبتلا ہو کر اس کے گرد طواف کرتا نظر آتا ہے۔

محبت کے رنگ شرم وحیا کے آنچل کے پیچھے سے جھانکے تو اور بھی خوبصورت لگنے لگتے ہیں۔ محبت فطرت ہے۔ محبت ایسا جذبہ ہے جو رنگ و نسل، مذہب و فرقہ، عمر، وقت سمیت کسی سرحد کی قید قبول نہیں کرتا۔ محبت انسان کی زندگی کا ایسا جزو ہے جس کے بغیر زندگی باقی نہیں رہتی۔ اپنے اردگرد کے ماحول پر غور کریں آپ کو محبت ہی محبت نظر آئے گی۔ اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جسم و روح کے درمیان محبت کا رشتہ ٹوٹتے ہی زندگی دم توڑ دیتا ہے گو کہ آج محبت کے تمام رشتوں پر نفرتوں کی گرد جم چکی پھر بھی دل تسلیم نہیں کرتا۔

لفظ محبت کی تعبیر دراصل محبت کے مختلف روپ ہیں۔ یہ وہ روپ ہیں جن سے زندگی میں ہر چاہنے اور چاہے جانے والے کا واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ کبھی یوں ہوتا ہے کہ زندگی کے کسی حصے میں کسی سے معمولی سا تعلق دل کی احساس پلیٹ پر دائمی نقش بن جاتا ہے۔

صوفیا کی اصطلاح میں محبت کی دو بڑی شکلیں ہیں، ایک حقیقی محبت اور دوسری مجازی محبت۔ حقیقی محبت تو صرف حاکم اعلیٰ سے ہی مختص ہے یعنی اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے سے نہیں جوڑا جا سکتا جبکہ مجازی محبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ انسان سے ہی منسوب ہے۔ مجازی محبت ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو حقیقی محبت سے روشناس کراتا ہے اور حقیقی محبت تک لے جا سکتا ہے۔ اس لیے مجازی محبت اسلام میں مانع نہیں ہے۔

دنیا کے ہر ادب میں محبت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ نظم اور نثر دونوں صورتوں میں دیگر ادیبوں کی طرح اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ادباء نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ محبت سے وابستگی رکھنے والے ادباء نے آنے والی نسل کے لیے جو کچھ تحریر کیا ہے ان میں اپنے خیالات، احساسات، جذبات، سماج، نفسیات اور معاش وغیرہ کی ترجمانی کی ہے۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنی محبت کا لطیف

جذبہ متنوع رنگ میں، جیسے قدرتی مناظر، پہاڑوں، دریاؤں، سرسبز وشاداب کھیتوں اور لہلہاتی فصلوں کے حسین اور دلکش مناظر پیش کئے ہیں۔ کبھی کسی افسانہ نگار نے ماں باپ اور معصوم بچوں سے محبت کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے تو کبھی کسی نے حب الوطنی یعنی اپنی دھرتی سے محبت کو موضوع بنایا ہے۔ کسی نے عاشق ومشعوق کی داستان محبت کو تحریر کیا ہے۔ رومانویت سے وابستہ ہر افسانہ نگار نے معاشرے میں محبت کی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی تحریروں کو مظلوموں کی آہ بن کر جذبہء محبت و ہمدردی کی شکل میں عام لوگوں اور ارباب حکومت تک پہنچایا ہے۔

اردو افسانوں میں چند رجحانات مشترک ہیں۔ جیسے محبت، حقیقت نگاری، سیاست اور تصوف وغیرہ۔ ان میں رومانویت سے وابستہ افسانہ نگاروں نے محبت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے اور اپنے افسانوں میں محبت کے مختلف روپ پیش کئے ہیں۔ سجاد حیدر پلارم سے لے کر آج تک جتنے بھی افسانہ نگار چلے آرہے ہیں۔ ہر ایک نے محبت کے موضوع پر ضرور لکھا ہے اور محبت کو متنوع رنگ میں تحریر کر کے قاری کو حظ پہنچایا ہے۔ ان افسانہ نگاروں کے ہاں اگر چہ محبت بنیادی جذبہ نظر آتا ہے لیکن یہ جذبہ غزل کے محبت جیسا نہیں بلکہ اس میں انسانی نفسیات کے مطالعے اور اس کے ساتھ ساتھ ان بنیادی رشتوں پر بھی زور دیا جاتا ہے جو معاشرے کے مختلف افراد اور طبقات میں بٹے انسانوں اور ان کے باہمی روابط پر اثر انداز ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں افسانے میں محبت محض محبت نہیں رہتا بلکہ فرد اور اس کے حوالہ سے سماج اور اقدار کا مطالعہ بھی بن جاتا ہے۔

محبت کے متنوع رنگوں میں سے ایک میاں بیوی کی محبت بھی ہے جسے اکثر افسانہ نگاروں نے انفرادی اور الگ شکل میں سماج کے سامنے لایا ہے۔ کسی افسانہ نگار نے میاں بیوی کی محبت کو وفاداری کا روپ دے کر کہانی لکھی ہے تو کسی نے بے وفائی کی خامی کی نشاندہی کر کے معاشرے کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور کہانی کار نے یہ ثابت کیا ہے کہ جن میاں بیوی کے درمیان وفاداری اور محبت کا رشتہ ہوتا ہے تو وہ گھرانے خوشحال زندگی گزارتے ہیں جبکہ اس کے برعکس جن میاں بیوی کے مابین بے وفائی وردھوکہ دہی کا بندھن رہتا ہے تو وہ خاندان زوال وپستی کی طرف آتے ہیں اور ساری زندگی غم وپریشانی میں بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ اردو افسانے میں افسانہ نگاروں نے محبت کے متنوع رنگ پیش کئے ہیں۔ جیسے ماں باپ سے محبت، مظلوم انسانوں نے محبت، معاشرے کے استحصال زدہ لوگوں سے محبت، جانوروں سے محبت، اپنے ملک سے محبت، غریبوں اور مجبور لوگوں سے محبت، پرندوں سے محبت، بیماروں سے محبت، قدرتی مناظر سے محبت، اپنے مذہب سے محبت، دولت سے محبت، علم سے محبت، نیک اور پاک دامن افراد سے محبت، اپنے بزرگوں سے محبت، ارباب حکومت سے محبت وغیرہ وغیرہ۔ اور اسی طرح ہر افسانہ نگار نے اپنے اپنے انداز بیان، طرز اسلوب اور تکنیک کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔

ب۔رومانوی تحریک میں تصورمحبت اورافسانہ:۔

رومانوی تحریک میں تصورمحبت اور افسانہ سے پہلے رومانویت کے معنی اورمفہوم کے بارے میں جاننا چاہیے۔رومانویت اردوزبان کے لفظ ،،رومان،، سے مشتق ہے۔اگرچہ رومانویت کے معنی رومان سے یکسر مختلف ہیں۔مگراس کی بنیادلفظ رومان ہی ہے۔لہذا رومانویت پر بحث کرنے سے قبل ''رومان'' کے لفظ کا ایک سے سری جائزہ لیا جائے گا۔اردوزبان کے لفظ رومان کے لیے انگریزی کا لفظ رومانس (Romance) مستعمل ہے بلکہ بقول ڈاکٹرمحمدحسن ,, رومان کا لفظ رومانس سے نکلا،،(۲۶)

یہ لفظ پہلے پہل یورپی ادب میں مستعمل رہا پھراردوادب میں شامل ہوا۔رومان کے معنی عشق ومحبت کے قصے وکہانیاں کے تھے مگراس کے علاوہ دیگر مفاہیم بھی تھے جن کوڈاکٹرخان محمداشرف یوں لکھتے ہیں:

> ابتداء میں یہ لفظ زیادہ تر منفی مفہوم میں عشق ومحبت کی ناپسندیدہ اور غیرمعیاری کہانیوں کے لیے استعمال ہوتا تھا،انگریزی میں اس کے ساتھ ساتھ یہ ہمت وشجاعت اوراسرار وخوف پرمشتمل داستانوں اورکہانیوں کے لیے مستعمل تھا۔(۲۷)

یہ اصطلاح چونکہ خالصتاً انگریزی ادب کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کی نامورلغات فرہنگ آصفیہ ،نورالغات ،جدید نسیم الغات ،امیر الغات ،لغات کشوری ،اردو انسائیکلو پیڈیا اف اسلام اور رئیس الغات میں رومان کا لفظ شامل ہی نہیں ہے۔فیرورز الغات اردو میں رومان کے معنی یہ ہیں:

> انگریزی رومانس کا مورد،مذکر،ادب کی وہ صنف جس پرحقیقی زندگی سے غیرمتعلق واقعات بیان کیے جائیں،فرضی داستان،خیرت انگیز واقعہ،عشق ومحبت کی داستان۔(۲۸)

رومان کے معنی کو بیان کرنے کے بعد اب رومانیت کے لفظ کی چھان بین اور معنی زیرغور لاتے ہیں ۔رومانیت کے بارے میں ڈاکٹرمحمد ہاورن قادر نے لکھا ہے:

> رومانیت جس کے لیے انگریزی میں لفظ رومنسزم (Romantism) استمال ہوتا ہے۔اس کا استعمال انگریزی ادب میں اٹھارویں صدی کے آخری سالوں سے شروع ہوا تھا۔یوں جرمنی مصنفین گوئٹے اورشیلر پہلے مصنفین تھے جنہوں نے اپنی تحریروں میں رومانوی کا لفظ استعمال کیا (۲۹)۔

رومانیت کے بارے میں ڈاکٹرخان محمداشرف لکھتے ہیں۔''رومانویت کی اصطلاح فن وادب کی ایک مخصوص تحریک اوراس کی ان خصوصیات کوظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جواس کوکلاسیکی دور کے ادب سے ممتاز

کرتی ہے۔''(۳۰)

رومانویت کو اگرچہ مختلف علاقوں اور ادوار میں مختلف مطالب کے لیے استعمال کیا گیا لیکن چونکہ اس کی بہت سی اقدار مشترک ہیں۔لہذا اسے ایک نام بھی دیا جا سکتا ہے تو یوں تاریخی تناظر میں رومانویت اس تحریک کا نام ہے جو کہ یورپ میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئی۔اس سلسلے میں ڈاکٹر سہیل احمد خان رقمطراز ہیں:

> رومانیت انسانی ذہن کی ایک مستقل کیفیت ہے جسے کسی بھی دور میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔تاہم اسے ادبی اصطلاح کے طور پر اس لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ ۱۷۷۹ء(انقلاب فرانس) سے ۱۸۳۰ء تک یورپی ادب میں ایسا رجحان ظاہر ہوا جو نو کلاسیکیت کے مقلدانہ اسلوب کے خلاف بغاوت تھا۔(۳۱)

اٹھارویں صدی کے آخر میں مغربی ادب کلاسیکی ادب کے جمود کے زیر سایہ تھا اور انحطاط کی طرف مائل تھا۔چنانچہ اس جمود سے رومانوی تحریک نے جنم لیا۔یہ رومانوی رجحان نہ صرف ادب و شاعری کے تکنیکی سانچوں کے خلاف تھا بلکہ بحیثیت مجموعی پورے سماج کے خلاف انسان کی آزاد تخیلی و جذباتی فضا کے حق میں ایک اعلان تھا۔کلیساء کی سنگلاخ سیادت دم توڑ رہی تھی اور جدید علوم وفنون روز افزوں ترقی پر تھے۔عقل وفکر و تخیل اور شعور اپنی آزاد فعالیت پر مائل تھے۔روسو نے فرد کے محیط میں ایک وسیع کائنات کا سراغ لگایا اور فرد اور معاشرے کی دوئی کو مسمار کر دیا۔ادبی طور پر اس نے تکنیکی پابندیوں،قوانین اور ٹائپ کرداروں کی جگہ ایسے کردار متعارف کروائے جن کی فعالیت منفرد اور لاثانی تھی۔یہ رجحان عام ہوا تو والٹیئر نے آزادی کے جوش میں کائنات کو انسان کا قید خانہ قرار دیا ہے۔اس نے انسان کے تخیل کو ہر تقسیم کے خارجی دباؤ اور سنگلاخ پابندیوں کے خلاف حرکت دی۔

مغربی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب رومانیت کا ابائی گھر ہے۔رومانیت اور کلاسیکیت کا ایک چکر (Cycle) ہے۔جو کہ وقفے وقفے سے اپنی وقعت اور اہمیت کے لحاظ سے مقبول ہوتا چلا جاتا ہے۔رومانیت عروج کے بعد زوال پذیر ہو کر کلاسیکیت کی مقبولیت کی راہ ہموار کرتی ہے اور پھر کلاسیکیت کا نقطہ عروج رومانیت کی آمد کی نوید سناتی ہے اور مغرب میں تو تقریباً ہر بیس سے پچیس برس بعد اس چکر کو گھومتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔یہ چکر اسی وجہ سے چلتا ہے کہ کلاسک ساخت و ہیت کے طے شدہ پیمانوں کے اندر رہ کر اظہار خیال اور ابلاغ بہت مشقت طلب اور ریاضیت طلب کام ہے۔ایک طرف ساخت و ہیت کو ملحوظ خاطر رکھنا اور دوسری طرف ابلاغ تخیل کو سرانجام دینا ایک نہایت کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔یہاں تک کہ تکنیکی طور پر محض ہیئت اور ساخت کے تقاضوں کو نبھانا ہی اعلیٰ و عالیہ ادب قرار پاتا ہے اور ادب کی تخلیق صرف ایک تکنیکی عمل ہو کر رہ جاتا ہے اور ادباء و شعراء اپنے

خیالات کی ترسیل میں دقت سے ہمکنار ہونے لگتے ہیں ۔پھر رومانویت کا آغاز ہوتا ہے تو وہ کلاسیکیت کے ادبی سانچوں کوتوڑ دیتے ہیں ۔اور آزادہ خیالی کی راہ اپناتے ہیں ۔یوں پھر رومانویت ترقی کرتی چلی جاتی ہے اور جب یہ آزادہ خیالی بے راہ روی کا اس حد تک شکار ہوجائے کہ اس رومانویت کے تحت تخلیق شدہ ادب کوادب تسلیم کرنے میں پس وپیش ہوتو پھر کلاسیکیت اپنا سحر دکھاتی ہے اور ادب پر رفتہ رفتہ غالب آجاتی ہے ۔یوں کلاسیکیت اور رومانویت کا یہ چکر اپنا عمل دہراتا رہتا ہے ۔رومانیت اصل میں ایک مزاج کا نام ہے جو کہ وقتاً فوقتاً رونما ہوتا رہتا ہے ۔

رومیوں کے دور تسلط میں گال (فرانس) میں جو ملکی زبان لاطینی اور مقامی بولیوں کے میل جول سے بنی اسے رومانا لینگوا کہتے ہیں ۔اس زبان میں جو قصے لکھے گئے وہ رومان کہلائے ۔بعد میں ان کا اطلاق شجاعانہ کارناموں کے بیان پر ہونے لگا ۔انگلستان میں رومان کی ترویج سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی ۔گوئٹے بھی ابتداء میں رومانیت کی جانب مائل ہوگیا لیکن بعد میں اسے مرض قرار دیا ۔روسو کو رومانیت کا باپ کہا جاتا ہے ۔اس نے قاموسیوں کی عقلیت اور ترقی پسندی کی مخالفت میں ''فطرت کی جانب موڑ جاؤ'' کا نعرہ لگایا اور کہا کہ سائنسی تحقیق اور فلسفیانہ تدبر غیر فطری ہے ۔تہذیب وتمدن نے انسان کو فطرت سے دور کردیا ہے ۔رومانی شعراء ورڈزورتھ وغیرہ نے فطرت پرستی کو ایک باقاعدہ نظریہ بنادیا ۔کارلائل اور کولرج جرمنوں کی رومانیت سے متاثر ہوئے تھے ،بائرن ،شیلی اور کیٹس نے انگلستان میں رومانی تحریک کی ترجمانی اپنی شاعری میں کی ۔فرانس میں وکٹر ہیوگو ،الگزنڈر ڈوما اور دی مسے اور امریکہ میں تھیورو نے اسے پھیلایا ۔رومانیت کے ادبی پہلو کے حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> ادبی لحاظ سے رومانیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس میں پر جوش جذبات کے باساختہ اظہار کو اولین اہمیت دی جاتی ہے ۔رومانی شعراء اور ادباء اظہار نفس کی راہ میں ہیئت کی پابندیوں سے بے نیاز ہوتے ہیں ۔جبکہ کلاسیکی شعرا ہیئت (فارم) کو اہم سمجھتے ہیں ۔رومانی قصہ نویس ایسا ماحول پیش کرتے ہیں جس میں اعجوبگی اور غرابت پائی جائے ۔انہوں نے عجیب وغریب مہمات ،بھوت پریت ،شکستہ محلات ،ناکام عشاق ،خانماں برباد رئیس زدوں کی کہانیاں لکھی ہیں ۔رقیق جذبائیت کے باعث رومانی قصے بچوں اور ناپختہ ذہن وذوق کے لوگوں ہی کو محفوظ کرسکتے ہیں ۔فلسفے میں رومانیت خرد دشمنی کی روایت سے تعلق رکھتی ہے ۔ولیم جیمز ،نیٹشے ،شوپنہار ،برگساں وغیرہ وجدان اور ادارے کو عقل وخرد پر فوقیت دیتے ہیں اس لیے انہیں رومانی فلسفی کہا جاتا ہے (۳۲)۔

اردو میں رومانیت کی ابتداء اگرچہ انیسویں صدی کے اخری حصے میں ہوچکی تھی تاہم اسے فروغ بیسویں صدی کے پہلی جنگ عظیم کے بعد حاصل ہوا۔اردو میں اس کا آغاز سرسید تحریک کے ردعمل کے طور پر ہوا۔سرسید نے عقلیت، مادیت اور حقائق نگاری پر بہت زیادہ زور دیا اور فرد کی زندگی کی جذباتی اور رومانی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ کچھ عرصہ تک یہ سکہ چلتا رہا لیکن بالآخر سرسید کے عقلی اور مقصدی ادب کے خلاف رومانوی ادیبوں نے شدید احتجاج کیا اور اس طرح شعر وادب کی دنیا میں نئی راہوں کی نشاندہی کی اور اس وقت کے حالات اور مغربی علوم کی آمد نے اس تحریک کو آگے بڑھنے میں مزید مدد دی۔ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اپنی کتاب افسانہ اور افسانہ کی تنقید میں لکھا ہے:

> ابتداء میں اردو افسانے پر ایک ایسا وقت بھی گزرا ہے جب ایک قسم کی جذباتی رومانیت اس پر غالب تھی لیکن اس جذباتی رومانیت میں کئی اثرات کام کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ایک تو مغرب کی رومانیت کا غلط تصور جسے اس زمانے کے لکھنے والے پوری طرح نہیں سمجھ سکے ۔دوسرے عنیت پرست مفکروں اور شاعروں کے اثرات جن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث اس زمانے کے لکھنے والوں کا ان سے دامن بچانا مشکل تھا۔تیسرے ناسازگار حالات کے باعث ایک فراری ذہنیت جو اس زمانے کے لکھنے والوں میں حالات کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے عام ہورہی تھی، چوتھے بورژواذہنیتں جو ایک مخصوص طبقے رکھنے کی وجہ سے اس زمانے کے لکھنے والوں میں عام تھیں اور جن کی وجہ سے وہ زندگی میں تعیش پرستی ہی کو کچھ سمجھتے تھے۔(۳۳)

علی گڑھ تحریک کی عقلیت اور مادیت کے خلاف ردعمل میں سرفہرست محمد حسین آزاد، میر ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر تھے۔ان لوگوں نے ان اسالیب کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں ادیب کا تخیل جذبے کی جوئے شیر کے ساتھ چلتا رہے۔لیکن آزاد کی رومانیت کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کی افتادطبع کی نقیب ہے۔جبکہ اس کے برعکس میر ناصر علی کا رومانی عمل شعوری نظر آتا ہے۔میر ناصر علی نے سرسید احمد خان کے علمی وادبی کارناموں پر نہ صرف تنقید کی ہے بلکہ انہوں نے سرسید کی سنجیدہ نثر کا جامد خول توڑنے کے لیے انشاء پردازی کا شگفتہ اسلوب بھی مروج کرنے کی کوشش کی اور انہوں نے سرسید کے مقابلے میں ''فسانہ ایام'' ''صدائے عام'' جیسے رسالے نکالے۔عہد سرسید میں شدید جذباتی رویے اور رومانی طرز احساس کی ایک اور مثال عبدالحلیم شرر ہیں۔شرر نے مسلمانوں کی اجتماعی افسردگی کے خلاف ردعمل پیش کیا اور اس شاندار ماضی میں آسودگی تلاش کی جس میں مسلمانوں کے جاہ وجلال اور ہیبت وجبروت نے مشرق ومغرب کی طنابیں کھینچ رکھی تھیں۔سلیم آغا قزلباش نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھا ہے:

> درحقیقت رومانیت ایک فطری تخلیقی ابال سے عبارت ہے اس کے زیر اثر فن کار زندگی کے میکانکی عمل کو بانظر تحقیر دیکھتا ہے اور ایک تند جذبے اور دروں بینی کے ایک شدید رجحان کے تحت ماحول کی طرف سے آنکھیں میچ کر اور اجتہاد کے عمل میں مبتلا ہو کر ادب کی تخلیق کرتا چلا جاتا ہے (۳۴)۔

یہ ایک رائے رومانیت کی فعالیت اور اجتہادی عمل کی واضح دلیل ہے۔ دوسری جانب تخیل کی جس پر رومانیت کی اساس قائم ہے۔ اسے ولیم بلیک نے رومانی عمل کا مخرج قرار دیا ہے اور اس امر پر زور دیا ہے کہ تخیل خدا کا وہ عمل ہے جس سے وہ اپنی مخلوق کے ساتھ وابستہ ہے۔ رومانیت مزاجاً انفعالی نہیں بلکہ بیشتر صورتوں میں فعال بھی ثابت ہوئی ہے۔ رومانی جذبے نے اکثر اوقات کائنات کا نقشہ بدلنے میں مدد دی ہے۔ چنانچہ رومانیت اس داخلی قوت کا نام ہے جو نامعلوم کو دریافت کرنے اور نئی شے کی تخلیق پر آمادہ کرتی ہے۔ رومانیت کا رشتہ محض خیالی دنیا سے ہی قائم نہیں ہوتا بلکہ خیال اور حقیقت کے امتزاج باہم کو عمل میں لانے کی سعی بھی کرتا ہے۔ رومانیت محض احیاء العجائب نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک مخصوص رویہ ہے۔ رومانیت میں آزادہ روی، انفرادیت تحفظ انا اور بغاوت کا عنصر موجود ہے۔ رومانیت وہ شرار سنگ ہے جو لہو ٹپکانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رومانی فن کار خوابوں کی دنیا میں ہلکورے لیتا ہے تاہم حقیقی دنیا کے ساتھ رابطہ قائم رکھتا ہے اور جن صداقتوں کو وجدان کے وسیلے دریافت کرتا ہے ان کو عامتہ الناس پر منکشف بھی کرتا ہے۔

رومانیت کی ایک اساسی خصوصیت ''محبت'' ہے جو بعض اوقات خودنگری کا رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے ڈانڈے نرگسیت کے ساتھ بھی جوڑے جا سکتے ہیں۔ سارا اساطیری اور داستانی ادب بھی رومانیت کی معطر خلوتوں اور جلوتوں ہی سے عبارت ہے بلکہ رومانیت دودھیا چاندنی کی طرح وہاں ہر سو بکھری دکھائی دیتی ہے۔ سلیم آغا قزلباش نے لکھا ہے کہ:

> رومانی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی، درد اور کرب کو اپنی شخصیت کا جوہر بنا لیا ہے ان کے نزدیک زندگی کا کوئی پہلو بھی درد اور اداسی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، کہیں موت کی آرزو کرتا ہے، کہیں جواں مرگی کو مبارک باد دیتا ہے، وہ اپنی محبوباؤں کو یا تو کسی دیو قامت اساطیری جن کے آہنی قلعوں میں مقید اور منتظر تصور کرتا ہے یا فراق کا گیت گاتے ہوئے دیکھتا ہے۔ زندگی درد ہے، انسانی جذبے اور حقیقت کے درمیان ایک مسلسل جنگ ہے اور اس کے زخموں کو وہ پھول سمجھ کر چومتا ہے اور اسی میں زندگی کا کیف اور حسن محسوس کرتا ہے۔ (۳۵)

اردو افسانے کے پہلے دور میں رومانویت کا رجحان نسبتاً زیادہ قوی تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو افسانہ داستان گوئی کی اس روایت سے منسلک تھا جس میں رومان کی پرواز کو تمام تر اہمیت حاصل تھی۔ اردو افسانہ نگار نے داستان گوئی کی اس روایت کے زیر اثر تربیت حاصل کی تھی۔ لامحالہ اس نے بتداء میں تخیلی انداز نظر کو اپنا لیا۔ چنانچہ سجاد حیدر یلدرم، آل احمد سرور نیاز فتح پوری، مجنون گورکھپوری اور بعض دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں حقیقت کی بہ نسبت رومانوی رجحان نے زیادہ شدت حاصل کر لی اور انہوں نے افسانے کا جو پیکر تراشا اس میں ارضی مظاہر کے ساتھ افسانہ نگاری کا رابطہ ایسا مضبوط نہیں تھا۔ یہ سب افسانہ نگار ایک تخیلی فضا میں سانس لے رہے تھے اور محبت کے افلاطونی نظریے کی عکاسی حسن کے غیر ارضی تصور کی نقاب کشائی اور مظاہر پر ایک چھلتی سی نظر دوڑانے کے عمل میں مبتلا تھے۔ انہوں نے ماحول کی ہر کروٹ یا رجحان کو ایک علامتی مظہر سے واضح کیا ہے، چنانچہ اسی لیے کردار کی بجائے مثالی نمونے Types کی پیش کش تک خود کو محدود رکھا ہے۔ بعض اوقات تو اعلیٰ انسانی قدروں مثلاً حسن، سچائی، محبت وغیرہ کو بھی علامتی مظاہر سے اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ایک طرح سے اردو میں افسانے کا آغاز ہی رومانی تحریک سے ہوتا ہے۔ اردو ادب میں افسانے میں زیادہ تر دو رجحانات غالب رہے ایک رومانی رجحان اور دوسرا ترقی پسند تحریک کا رجحان۔ ترقی پسند یا حقیقت پسند رجحان کی طرح رومانی رجحان بھی ایک مضبوط رجحان ہے جس کا اثر ہر عہد کے افسانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ رومانوی افسانہ چاہے کیسا بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو میں افسانے کی ابتداء رومانیت پسندوں کے ہاتھوں ہوئی۔

سجاد حیدر یلدرم اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ رومانیت یلدرم کی شخصیت بھی ہے اور ان کا اسلوب فن بھی۔ ابتدائے شباب میں ہی رومانی قسم کی بغاوت ان کے ذہن میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ماحول سے مطمئن نہ تھے۔ اسے اپنے ذہن و خیال کے مطابق مقلب کرنے کے آرزومند تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد ہارون قادر، یلدرم کی رومانیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> سجاد حیدر یلدرم نے اپنی ادبی زندگی کا بیشتر حصہ مخزن کے ساتھ بسر کیا اور اردو نثر رومانویت کی اساس پر ایک طرح نو کا اہتمام کیا۔ رومانویت یلدرم کی شخصیت بھی ہے اور اس کا اسلوب بھی۔ ترکی سے ازلی محبت کی بدولت ہی یلدرم کے ادب میں مشرق و مغرب کا امتزاج ملتا ہے کیونکہ ترکی مشرق و مغرب کا جغرافیائی سنگم ہے۔ یلدرم کی جمالیات میں حسن کا الوہی زاویہ دریافت کرنے اور ارضی حسن سے رومانی انبساط حاصل کرنے کا رجحان نمایاں ہے انہوں نے اردو ادب کو تعلیم یافتہ عورت سے متعارف کرایا اور اس کی جمالیاتی تحسین کی اور اسے مردانہ زندگی کی قوت متحرک قرار دیا۔ خارستان کی نسرین نوش ایک ایسا ہی پیکر ہے جس کی بیداری کے ساتھ کائنات بیداری ہوتی ہے اور اس کی مسکراہٹ کے ساتھ کائنات مسکراتی ہے یلدرم کو رومانویت کے دور

عروج کا مطلع اول قرار دیا جاتا ہے۔(۳۶)

یلدرم ترکی ادب سے متاثر ہیں۔ان کے نزدیک زندگی صرف ''محبت'' ایک ایسا عنصر ہے جو ادب اور افسانے جیسی صنف لطیف کا موضوع بن سکتا ہے۔ان کا خیال تھا کہ ادب اور ادیب کو زندگی کے ان جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے جس میں پھنس کر ادیب مصلح اور ادب کو پند و وعظ بننا پڑتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں کو عورت اور فطرت کے حسن اور ان دونوں کے فطری رومان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ان کا موضوع عورت اور مرد کی وہ محبت تھی جو فطرت کے قوانین کے سوا کسی اور قسم کی رسوم و قیود کی پابند نہ تھی۔اس بات کا اظہار انہوں نے اپنے افسانوں میں کھلے طور پر کیا ہے۔یلدرم کی رومانویت کی سلسلے میں انور سدید لکھتے ہیں:

> سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت میں ایک ایسا معصوم تحیر موجود ہے جو بچے کے چہرے پر کھلونے حاصل کرنے کی آرزو سے پیدا ہوتا ہے اس میں گہرائی یقیناً نہیں لیکن جذبے کی سادگی اور ملائمت موجود ہے ور یہ متوازن کیفیت زیر و بم ضرور پیدا کرتی ہے۔بیسویں صدی کے اوائل میں یلدرم کے ادب کا یہ ذائقہ اتنا انوکھا اور دلکش تھا کہ ان کا عہد اور مستقبل دونوں اس سے متاثر ہوئے (۳۷)۔

اردو افسانے میں رومانیت کے حوالے سے ایک معتبر نام نیاز فتح پوری کا بھی ہے۔نیاز فتح پوری کے افسانے اس دنیائی وجود اور غیر حقیقی زندگی کی سب سے بڑی مثالیں ہیں۔''شاعر کا انجام'' اور'' شہاب کی سر گزشت'' دو ایسے افسانے تھے جو بیشتر نوجوان ہر وقت ورد زبان رکھتے تھے۔نیاز کے طرز تحریر اور اسلوب فکر میں گیتانجلی سے رومانی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔وہی شکل، وہی انداز بیان اور تمنا پسندی، وہی بات سے بات پر وجد کرنے اور ہر چیز کو اس طرح دیکھنے کی کوشش جیسے اس کا ماورائی وجود ہے اور وہی حسن و عشق کے بارے میں فلسفیانہ طرز خیال۔ان سب چیزوں نے اردو افسانے کو بڑی مدت تک متاثر رکھا ہے۔

نیاز کی ابتدائی تحریروں میں رومانیت کا غلبہ ہے۔ان کے ہاں ارضی چیز نہیں ملتی، ماورائی چیزیں ملتی ہیں۔کردار نگاری میں بھی ماورائی یکسانیت ملتی ہے۔ان میں عام انسانی کرداروں کی نوک پلک انداز و ادا اور ارتقاء نہیں ملتا۔شروع سے لے کر آخر تک ایک بنیادی نعمہ ہے جو شخصیت پر حاوی ہے۔ان کا اپنا کوئی لہجہ، زبان اور انداز گفتگو نہیں۔یہ سب نیاز کی سجی سجائی بے حد ادبی زبان ہے۔انداز بیان کا انداز مکالموں کی عبارت سے ہوتا ہے۔ نیاز کی رومانویت کے سلسلے میں انور سدید یوں رقمطراز ہیں:

نیاز کی شخصیت کو ایک مخصوص ڈھانچے میں تبدیل کرنے میں ترکی کی انقلابی شاعرہ ''نگار بنت عثمان'' کی شاعری کا عمل دخل بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ نیاز کی رومانیت نے کئی سرچشموں سے فیض حاصل کیا اور ادب میں اس کا متنوع اظہار یوں ہوا کہ ابتداً نیاز نے شاعری کی ، پھر ناول اور افسانے لکھے اور جب نگار جاری کیا تو انہوں نے ادب اور زندگی کی تنقید کے علاوہ علمی موضوعات کو بھی رومانی نقاد کی طرح کھنگالنے کی کوشش کی۔ نیاز کی رومانیت کی خصوصیت تخیل اور صرف تخیل سے عبارت ہے۔ انہوں نے پرتو جمال کا مشاہدہ خود اپنی آنکھوں سے کرنے کی کوشش کی تو انہیں فطرت کا حسن کائنات کے ذرے ذرے میں بکھرا ہوا نظر آیا اور وہ اس سرسراتی ہوئی کیفیت کو جو محسوس تو کی جا سکتی ہے لیکن گرفت میں نہیں آتی ، ادب میں پیش کرنے لگے۔ (۳۸)

نیاز کی رومانیت کے لیے نور باطن مشعل راہ ہے اور فکر وجدان فطرت کے پوشیدہ بھید آشکار کرتا ہے۔ نیاز کی نثر میں خیال اور خیال کی مصوری ، شوق اور شوق کی تحلیل لفظی ، حسن اور حسن کا تاثر سب موجود ہے اور نیاز ایک ایسے رومانی فنکار کی صورت میں سامنے آتا ہے جو ہمہ تن جذبہ ہے اور فطرت نے اس پر مہربان ہو کر اس کے وجود کو اپنے حسن میں تحلیل کر لیا ہے۔

قاضی عبدالغفار ان ادباء میں سے ہیں جنہوں نے رومانیت کی افقی پرواز کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور فرد کو اس کی باس سونگھنے پر مائل کیا۔ ان کا ظہور تاریخ ادب کے اس مقام پر ہوا ، جب پریم چند اور حامد اللہ افسر کی حقیقت نگاری کی تحریک اپنے عروجی دور میں داخل ہو چکی تھی اور رومانی تحریک پر زوال آنا شروع ہو گیا تھا۔ قاضی عبدالغفار کا مقصد اس حسن کو اجاگر کرنا ہے جو انسان کی سیرت میں چھپا ہوتا ہے اور جو سطح پر صرف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کوئی دوسرے شخص سے ہم کلام ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں:

> اردو کے رومانی ادباء بالعموم نشیب سے فراز کی طرف دیکھتی ہے اور حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ قاضی عبدالغفار کی لیلیٰ آسمان سے زمین کی طرف دیکھتی ہے اور ان حقیقتوں کو اجاگر کرتی ہے جن تک ہوس پرست مرد کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ (۳۹)

مجنون گورکھپوری بھی رومانیت کے نمائندہ ہیں۔ ان کی رومانیت کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ مگر اس کی محبت کو مختصر لمحہ قرار دے کر اس کے بعد غم والم کو مسلسل ودائمی قرار دیا۔ ان کے افسانے اکثر اوقات حال سے ماضی کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ مجنون کی رومانی گاہ ماضی ہے۔ مجنون نے اردو رومانوی تحریک میں سوز وگداز اور کرب

مسلسل کا زاویہ پیش کیا ہے۔ چنانچہ مجنون کی رومانیت کے بارے میں انور سدید لکھتے ہیں:

> مجنون گورکھپوری کی رومانیت قنوطیت اور مایوسی کی پیداوار ہے۔ ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع محبت ہے لیکن ان کے ہاں محبت ایک مختصر سا لمحہ ہے اور اس کے بعد ایک مسلسل و دائمی غم۔ مجنون کے اس اسلوب کا نمائندہ افسانہ ''سمن پوش'' ہے اس افسانے میں منظر اور پیش منظر دونوں پر رومانی تحیر کی دھند چھائی ہوئی ہے۔ اس کی اولین مثال ''سمن پوش'' کا واحد متکلم ہے جو ناہید کی تصویر کی ایک جھلک دیکھ کر ہی ''آتش نمرود'' میں کود پڑتا ہے اور پھر اس ہیولے کو جو بار بار اس کے خیال کو گدگداتا ہے حقیقی زندگی میں تلاش کرنے لگتا ہے۔ (۴۰)

عرض یہ کہ مجنون کا انداز بیان نیاز اور خلیق دہلوی دونوں سے زیادہ سلجھا ہوا ہے۔ اس میں دشوار شاعرانہ نثر کی فراوانی نہیں۔ وہ قصے بیان کے انداز میں لکھتے ہیں لیکن بات بات میں شعر پڑھنا اور موقع بے موقع اشعار نقل کرنا ان کے رومانوی طرز تحری کی خصوصیت ہے۔ اکثر ان کے کردار اشعار میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے افسانے جذباتی سپردگی کے آئینہ دار ہیں، جنہوں نے اردو افسانہ نگاری پر بڑا اثر ڈالا ہے۔

انسانوں کے جذبات و احساسات کے احترام سے الفت و محبت پیدا ہوتی ہے۔ تعلقات میں استحکام آتا ہے اور انسانوں کے درمیان انس و ہمدردی اور ربط و تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جذبات و احساسات کو مجروح کرنے سے قربت دوری میں تبدیل ہوتی ہے۔ نفرت و کدورت پیدا ہوتی ہے۔ دل میں غیظ و غضب شعلہ زن ہو کر آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ محبت و انس کے ماحول میں انسان کی زندگی کے مسائل جتنی اسانی سے حل ہوتے ہیں۔ نفرت و دشمنی کے ماحول میں اتنے ہی مشکل ہو جاتے ہیں بلکہ دل میں چھپی نفرت و دشمنی بسا اوقات انسانی نظام زندگی میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے اور اس کے بڑے نتائج کا سامنا انسان کو کرنا پڑتا ہے۔

اسی لیے مذاہب عالم نے جذبات و احساسات کے احترام کی تعلیم دی ہے اور ایسے اداب سکھائے ہیں جن کو اختیار کرنے سے انسان کسی کے جذبات و احساسات کو مجروح کرنے سے بچ جاتا ہے اور رواداری و انس کے ذریعہ وہ دشمن کو بھی دوست بنالیتا ہے۔

ہندوستانی معاشرے میں قدامت پرستی کی بنا پر مرد اور عورت کے مابین تعلقات کو عیب خیال کیا جاتا تھا اور محبت کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جس کے بارے میں شاعر علی شاعر نے لکھا ہے:

> ہندوستانی سماج میں تنگ نظری اور قدامت پرستی کی وجہ سے عورت اور مرد کے درمیان روابط کو سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور محبت کو ناپسندیدہ نظروں سے دکھا جاتا تھا۔ اردو اولین افسانہ نگار منشی پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے مجتہدانہ انداز سے افسانہ نگاری کی وادی میں قدم رکھا اور سماجی روایات

کی فرسودہ و دقیانوسی دیواریں منہدم کر کے اردو افسانے کی عمارت کو حقیقت نگاری کی بنیادوں پر استوار کیا۔ منشی پریم چند نے اپنے افسانوں کے ذریعے واضح کیا کہ انسانی جذبات و احساسات کے دریا کی فطری گزرگاہ کو روکنا ذہنی و جذباتی گھٹن کا باعث بنتا ہے سجاد حیدر یلدرم نے اپنے افسانوں کے ذریعے جذبۂ محبت کی اہمیت کا احساس دلایا۔ (۴۱)

فکشن کے حوالے سے رومانوی جذبات و احساسات کی ترجمانی روسی، فرانسیسی اور انگریزی ادب میں بہت سے فکشن نگاروں نے کی ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارا موضوع اردو ادب سے متعلقہ ہے لہذا اردو ادب میں فکشن کے حوالے سے خصوصاً افسانہ کی صنف میں کئی افسانہ نگار رومانوی جذبات و احساسات کے ترجمان بن کر ابھر آئے۔

بیسویں صدی میں سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش نے اصلاحی اور رومانی رنگ افسانے لکھنا شروع کیے اور بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں نیاز فتح پوری اور مجنون گورکھپوری بھی افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری اور مجنون گورکھپوری وغیرہ ترکی اور انگریزی افسانہ نگاروں سے متاثر تھے۔ یہ افسانہ نگار ان زبانوں کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بھی کرتے تھے اور اردو افسانہ نگاری کے فن اور نئی چیزوں سے روشناس بھی کرا رہے تھے۔ ان کے افسانوں میں حسن و عشق کی رنگینی، زبان و بیان کی طاقت اور نفسیاتی و فلسفیانہ بصیرت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ قاری کو ان کے افسانوں میں اردگرد کے افسانوں کی حقیقی زندگی اور اس کے مسائل نہیں ملتے بلکہ تخیل کی ایک خوبصورت آراستہ دنیا ملتی ہے جس میں حسن کا جذبہ اور اس کی نفسیاتی نزاکتیں ہی اہمیت رکھتی ہیں۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد اردو میں روسی، فرانسیسی اور انگریزی کے معیاری افسانوں کے ترجمے کثرت سے شائع ہونے لگے۔ منصور احمد، خواجہ منظور حسین، جلیل قدوائی اور دوسرے ادیبوں نے مغرب کے ایسے فن پاروں کو اردو میں منتقل کیا جن میں افسانہ کے فن اور تکنیک کا ایک ترقی یافتہ تصور ملتا ہے۔ اس دور کے اردو افسانہ میں تین رجحانات نمایاں ہیں۔ سب سے اہم رجحان پریم چند اور ان کے مقلدین مثلاً سدرشن۔ علی عباس حسین، اعظم کریوی اور اپندر ناتھ رشک کا حقیقت پسندانہ رجحان تھا۔ ان افسانہ نگاروں نے سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات پر نظر رکھی۔ انہوں نے گاؤں کی زندگی اور اس کے مسائل نمایاں طور پر اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ ان کا دردمند دل عام انسانوں کی محرومیوں اور تکلیفوں سے تڑپ اٹھتا ہے اور وہ ان کی زندگی کے حالات اور واقعات کو ایسے موثر ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ دوسروں کے دلوں میں بھی ان کے لیے ہمدردی اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ مقامی رنگ سے وہ بڑا کام لیتے ہیں۔ ان افسانوں کی مقبولیت میں بول چال کی بے تکلف بیان اور سیدھی سادی تکنیک کا بہت دخل ہے۔ اس دور میں جو دوسرا نمایاں رجحان دیکھنے کو ملتا ہے، اسے زندگی کی رومانی و رجذباتی ترجمان کا رجحان کہا جا سکتا ہے۔ اس کی نمائندگی سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتح پوری اور مجنون گورکھپوری کر رہے تھے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت سے

زیادہ تخیل کی کارفرمائی ہے۔ان کے افسانوں کی فضا رومانی تصورات اور لطیف جذبات سے بوجھل ہے۔ان کے یہاں فرد کے جذباتی رشتوں مثلاً عشق ومحبت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔وہ انسانی جذبات کو جاگیردرانہ سماج ،قدامت پسندانہ رسم ورواج اور فرسودہ اخلاقی بندھنوں سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فنی محاسن کا ایک نیا انداز ہے۔اسلوب اور اظہار بیان کی دلکشی پر خاص توجہ دیتے ہیں۔تیسرا رجحان مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی اور اس کے مسائل اصلاحی نقطہ نظر سے پیش کرنے کا رجحان ہے۔یہ سلسلہ اگر ایک طرف نذیر احمد سے تو دوسری طرف سلطان حیدر جوش سے ملتا ہے۔یہ بات صحیح ہے کہ ابتداء میں کرشن چندر،اختر انصاری اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے افسانوں میں رومانی اور جذباتی انداز نظر غالب رہا لیکن آہستہ آہستہ ان کے افسانوں میں بھی سماجی موضوعات اور مسائل جگہ لینے لگے۔ان کا سماجی شعور جیسے بیدار ہوگیا۔ان کے افسانوں میں بھی زیادہ گہرائی اور فنی دلکشی پیدا ہونے لگی۔یوں تو اس دور میں پروفیسر محمد مجیب ،حیات انصاری ،اختر حسین رائے پوری اور بعض دیگر ادیبوں نے بھی کامیاب افسانے لکھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے عہد میں کرشن چندر،راجندر سنگھ بیدی ،عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے اردو افسانے کی سب سے نمایاں خدمت کی ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب کے رومانوی افسانہ نگاروں نے شخصی محبت کا تصور،نوعیت اور کیفیت کو ایک دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے اکثر کرداروں کو محسوس کیا گیا ہے جنھوں نے معاشرے میں مثبت تبدیلیاں لانے کی سعی کی ہے اور رومانوی جذبات واحساسات کے صحیح ترجمان بن کر واضح نظر آتے ہیں۔

ج۔حقیقت نگاری میں تصور محبت اور افسانہ:۔

رومانی تحریک نے ادب اور خیال کی دنیا میں جو انقلاب بپا کردیا تھا اس نے زندگی کے مادی بوجھ سے نجات حاصل کرکے آسمانی رفعتوں میں پرواز کا رجحان پیدا کیا۔رومانی تحریک کے پہلو بہ پہلو ایک ایسی تحریک بھی مائل بہ عمل نظر آتی ہے جو رومانیت کی ضد تھی اور زندگی کو اس کے اصلی رنگوں میں پیش کرنے کی سعی کر رہی تھی۔یہ حقیقت نگاری کی تحریک تھی جس نے اساسی طور پر موجود زندگی اور اس کے گردو پیش کو اہمیت دی اور اس شعور کو بیدار کرنے کی سعی کی جس سے رومانی ادیب بالعموم اغماض برت رہا تھا۔

حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں۔؟اور حقیقت نگاری کا مفہوم اور مقصد کیا ہے۔؟ان سوالات کا جواب جاننے اور سمجھنے کے لیے تنقیدی اصطلاحات میں ابوالاعجاز حفیظ صدیقی نے لکھا ہے:

> ادب میں اشیاء اشخاص اور واقعات کو کسی قسم کے تعصب ،غنیت ،موضوعیت اور رومانیت سے آلودہ کیے بغیر دیانت وصداقت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش حقیقت پسندی یا حقیقت نگاری کہلاتی ہے۔باالفاظ دیگر حقیقت پسندی یا حقیقت نگاری کے معنی ہیں خارجی حقائق (مثلاً سماجی

TH-21157.

زندگی اور اس کے مسائل کو حتی المقدور معروضی صحت کے ساتھ پیش کرنا کسی خیالی یا مثالی دنیا کی بجائے اس ناقص مگر حقیقی دنیا کو موضوع بنایا، یا یست کی بجائے ہست کی تصویر کشی۔ گورکی کہتا ہے: ''بغیر کسی رنگ وروغن کے آدمیوں اور ان کی زندگی کا سچا بیان حقیقت نگاری کہلاتا ہے۔(۴۲)

ادب فن کی یہ مشہور تحریک جس کا آغاز رومان پسندوں کی رقیق جذباتیت اور بے راہ روتخیل آرائی کے خلاف احتجاج سے ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں عوام کی ہمہ گیر بیداری کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ اس زمانے کے اکثر اہل قلم نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو بالائی طبقات کے معاشی اور معاشرتی تصرف سے نالاں تھے اس لیے قدرتاً انہیں عوامی زندگی سے ہمدردی پیدا ہوگئی اور جرمنی، فرانس، روس اور انگلستان کے ادباء اور قصہ نویس روزمرہ کے شہری اور دیہاتی زندگی کی ترجمانی کرنے لگے۔ اس طرح ادبیات میں حقیقت نگاری کو فروغ ہوا جو آہستہ آہستہ ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ علی عباس جلالپوری نے ادب میں حقیقت نگاری کے تصور اور فروغ کے بارے میں لکھا ہے:

انگلستان میں میریا اجورتھ نے سب سے پہلے دیہاتی زندگی کے جیتے جاگتے مرقع پیش کیے۔ ڈکنز کے قصوں میں اس دور کے نچلے طبقے کے مصائب، آلام کی سچی اور درد بھری تصویریں ملتی ہیں۔ فرانس میں بالزک اور ستاں دال کے ناولوں میں یہ تحریک پروان چڑھی۔ بیسویں صدی میں اشتراکی انقلاب کے بعد اس تحریک نے ترقی پسندی کا روپ دھار لیا۔ ترقی پسند شاعر اور قصہ نویس عوام کی روزمرہ زندگی کی عکاسی اور ترجمانی ہی نہیں کرتے بلکہ ان کے انقلابی ولولوں کی آبیاری بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں پریم چند ایک بڑا حقیقت نگار تھا جو اواخر عمر میں ترقی پسندی سے رجوع لایا۔ پریم چند کی اس روایت کو کرشن چندر نے بام کمال تک پہنچا دیا۔(۴۳)

ادب میں حقیقت نگاری، رومان اور کلاسیکی نظریے سے انحراف کے طور پر شروع ہوئی۔ عالمی ادب میں اس کی عمر تقریباً ڈیڑھ سو سال ہے۔ سب سے پہلے لفظ La -Realism فرانس میں استعمال ہوا۔ اس کے بعد جرمنی اور پھر یورپ میں اس تحریک نے زور پکڑا۔ اس تحریک میں شامل لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ ارٹسٹ کو اپنے اردگرد کے روزانہ کے واقعات اور ماحول اپنے عصر کے سیاسی اور سماجی حالات سے متعلق ہونا چاہیے اور اپنی تحریروں میں ان واقعات وحالات کو من وعن بیان کرنا چاہیے۔ سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

جے اے کڈن نے حقیقت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے ''بنیادی طور پر ادب میں حقیقت نگاری زندگی کی عکاسی کرنے کو کہتے ہیں۔ اس کا تعلق مثالیت سے نہیں ہے اور نہ کسی شے کو اس کی بساط سے زیادہ خوبصورت بنانے سے۔ حقیقت نگاری میں کسی چیز کو ڈھکے چھپے الفاظ میں

پیش نہیں کیا جانا چاہیے ۔قاعدے کے مطابق کسی غیر معمولی یا فائقی Transcendental
عکاسی سے حقیقت نگاری کا کوئی تعلق نہیں ۔(۴۴)

دراصل کرشن چندر کے ہاں رومان اور حقیقت نگاری کا ایک ایسا امتزاج پایا جاتا ہے جو اردو کے دیگر افسانہ نگاروں میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے ۔وہ صحیح معنوں میں رومانی حقیقت نگاری کے پیش رو افسانہ نگار کہے جا سکتے ہیں ۔یہاں اس زاویے کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں غیر ملکی ادب کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام بھی انجام پاتا رہا ہے ۔اس دور کے مترجمین کی جس نوع کے افسانوی ادب پر مرکوز ہوئی ۔وہ رومانوی عناصر سے مزین تھا۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ رومانوی نثر نگار فقط رابندر ناتھ ٹیگور کی رومانیت کے خوشہ چین نہیں تھے بلکہ انگریزی ادب کے مطالعہ سے وہ والٹر پیٹر اور اسکر وائلڈ کے خیالات سے بھی متاثر ہوئے تھے ۔محبت کے بارے میں پریم چند کا نظریہ ہے کہ ''وہ محبت جس کی منزل وصال ہے محبت نہیں، نفس پرستی ہے''(۴۵)

رومانیت اور حقیقت نگاری کی تحریکیں ایک طویل عرصے تک الگ الگ جہت میں سفر کرتی رہیں جب ترقی پسند تحریک کی ابتداء ہوئی تو یہ دونوں دھارے آپس میں مل گئے ۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اسے زمین کی طرف متوجہ کیا اور ان سب کے امتزاج کو بھی نوع انسان کی بہبود میں صرف کرنے کے لیے ادیب کی فکر کو داخل سے خارج کی طرف پیش قدمی کی راہ دکھائی ۔اہم بات یہ ہے کہ رومانی فنکاروں نے تخلیق کے میدان میں داخلی مطلق الغنانی حاصل کی تھی اور خارج کو بدلے بغیر اپنی ایک الگ تخیلی دنیا داخل میں سجالی تھی ۔

پریم چند نے اردو افسانے کو داستانی ماحول سے نکال کر اس کا شستہ زندگی کے ساتھ قائم کر دیا تھا چنانچہ پریم چند کے افسانوں میں ہندوستان معاشرہ اپنے حقیقی روپ میں نظر آتا ہے اور انہوں نے انسانی عظمت اور محنت کو بلند مقام عطا کرنے کی سعی کی ہے ۔تاہم پریم چند کے ہاں کسی خاص نظریے کی بازگشت نظر نہیں آتی اور مقصد زیر سطح رہتا ہے ۔اس سلسلے میں انور سدید رقم طراز ہیں:

> کرشن چندر طبقاً رومانی فنکار تھا اور بقول انتظار حسین بیشتر مقامات پر وہ زندگی سے گریزاں بھی نظر آتا ہے ۔تاہم اس کی معروضیت گہرے سماجی شعور کی آئینہ دار ہے اور اس کا فن عمرانی حقیقت کا عکاس ہے ۔انسانی زندگی کے بنیادی سوال کرشن چندر کے افسانوں کی بنت میں شامل ہیں اور وہ اپنے عہد کی نمائندہ حقیقت کو اسلوب کی فطری رعنائی میں پیش کرنے کا سلیقہ رکھتا تھا۔ کالو بھنگی، ان داتا، گرجن کی ایک شام، اور پیاسا وغیرہ چند ایسے افسانے ہیں جن میں انسان کی ازلی اور ابدی محرومیوں کے گرد حقیقی واقعات کا تانا بانا مرتب کیا گیا ہے اور سانس لیتی ہوئی زندگی کو ارتقا کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے ۔(۴۶)

اختر حسین رائے پوری کی افسانہ نگاری اسکر وائلڈ اور موپاساں کے زیر اثر شروع ہوئی تھی۔ تاہم ''محبت اور نفرت'' ان کے افسانوں میں زندگی کی پیکار اور آویزش کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اور ان میں سیاسی بیداری کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ ان کے اخری دور کے افسانوں میں ''دیوان خانہ'' میں معاشرتی شعور اور ''جسم کی پکار'' میں جنسی احساس کا پرتو صاف نظر آتا ہے اور یہ قاری کی داخلی سوچ کو کروٹ دیتے ہیں۔

سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند اردو افسانے کے دو اہم نام اور ستون ہیں۔ یہ دو نام ہی نہیں بلکہ دو رجحانات ہیں۔ ایک رومانیت کا اور دوسرا حقیقت نگاری کا لہذا بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ کئی ایسے نام ہیں جن کے ہاں یلدرم کا رومانی مزاج ہے اور بعض کے ہاں پریم چند کی طرح حقیقت نگاری کا رجحان غالب ہے اور ۱۹۴۷ء تک انہی دو رجحانات کی بازگشت اردو افسانے میں سنائی دیتی ہے۔ مثلاً نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی، مجنون گورکھپوری کے افسانوں میں رومانوی مزاج ملتا ہے جبکہ باقی ترقی پسند افسانہ نگاروں کا مزاج حقیقت نگاری سے ملتا ہے۔ لیکن ان رجحانات میں حقیقت نگاری کا رجحان غالب ہے۔ مثلاً رشید جہاں، احمد علی اور محمود الظفر کے افسانوں کا مجموعہ انگارے جو کہ موجودہ دور کے انتشار اور ناہموار حالات سے پیدا ہونے والی بغاوت کا آئینہ دار ہے۔

۱۹۳۶ء کے بعد تو ان چار افسانہ نگار جن میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے ہاں حقیقت کے زاویے زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں۔ کرشن چندر نے حقیقت میں رومان کا امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا رومان بھی رومانیت کے ذیل میں نہیں آتا اور ان کے رومان کا تعلق حقیقت سے ہے کرشن چندر کے کردار اسی حقیقی دنیا میں محبت کرتے ہیں اس لیے انہیں اکثر جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس جدائی کے پس منظر میں معاشی، معاشرتی حالات بھی موجود ہوتے ہیں۔

راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا تعلق بھی حقیقت نگاری کی طرف زیادہ اور رومان کی طرف کم ہے۔ ان کے ہاں موضوعات کا مکمل تنوع موجود ہے اور انہوں نے معاشیات، نفسیات، معاشرت، انسانی رشتے، پھر سماج ہر حوالے سے لکھا اور حقیقت سے ان کا گہرا رشتہ موجود ہے۔ جبکہ منٹو کا تعلق معاشرتی حقیقتوں سے گہرا ہے وہ ساری زندگی سماجی، معاشرتی منافقتوں اور غلاظتوں کی نشان دہی کرتا رہا۔ عصمت چغتائی نے بھی معاشی اور معاشرتی حالات کے تحت پیدا ہونے والی جنسی محرومیوں پر کہانیاں لکھیں اور متوسط گھرانے کی خانگی زندگی پر قلم اٹھایا۔

حیات اللہ انصاری کا افسانہ ''آخری کوشش'' اس حوالے سے شاید بہترین مثال ہے جو معاشی مسائل سے پیدا ہونے والی انسان کی بے بسی کی تصویر ہے۔ پریم چند کا افسانہ ''کفن'' حقیقت نگاری کی روایت میں ایک اہم سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ کفن بڑی بھیانک تصویر ہے۔ پریم چند کے ہاں بھی حقیقت نگاری کی ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے دیہات کی عکاسی کی ہمارے داخلی اور خارجی مشکلات کی کہانیاں بھی بیان کیں اور اپندر ناتھ

رشک اور خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا رشتہ خلاء سے نہیں زمین سے رہا لہٰذا ۱۹۴۷ء تک جو افسانہ سفر کرتے ہوئے پہنچا وہ ان رومان اور حقیقت دونوں رجحانات کے ساتھ آیا لیکن اس کی بنیاد زندگی اور اس کے مسائل ہی رہے۔ افسانوں میں رومان کی فضا بھی اس قسم کی ہے کہ اس کو سماج سے الگ نہیں کر سکتے یعنی رومان حقیقت کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے ہیں۔

اشفاق احمد ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری میں تصور محبت کی جھلک نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں مرکزی موضوع محبت ضرور ہے لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ یہ افسانے خواب وخیال کی افسانوی دنیا میں جھولے جھولتے، مافوق الفطرت جھیلوں میں غوطہ زن ہیں بلکہ ان کے افسانے تلخ حقائق کے بھی عکاس ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اشفاق احمد کی حقیقت نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ''اشفاق احمد ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی حقیقت نگاری کھری، بے ہنگم، اذیت ناک، فاحش اور انتہا پسند نہیں ہوتی۔'' (۴۷)

اشفاق احمد کی حقیقت نگاری میں محبت کا جذبہ سماجی اور اجتماعی نوعیت کا ہے۔ اس میں انسانی قدروں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدگیوں کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔ انہوں نے زمانے کی تلخیوں کو لطافت کی شرینی میں ڈبو کر کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے کہ یہ شرینی پڑھنے والے کو معنی کے نئے نئے ذائقوں سے آشنا کرواتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور کثیر الاضلاع ہے۔ ان کے افسانے بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی قندیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے آتے ہیں۔ (۴۸)

اشفاق احمد کی حقیقت نگاری میں محبت کا تصور صاف نظر آتا ہے۔ وہ زندگی کے سبھی پہلوؤں کو بے نقاب کرنا اپنا ادبی فرض سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں انسان پر بیتنے والے ہر حقیقت کو بیان کرنا اپنا مقصد گردانتے ہوئے کہانیاں لکھتے ہیں۔ بقول محمد حمید شاہد:

> اشفاق احمد کی شخصیت کے کئی روپ ہیں تاہم اس کے افسانے میری نظر میں یوں اہم ہیں کہ وہ چلتی کہانی کے بہاؤ کو توڑ کر انسانی لاشعور سے برآمد ہونے والے سوالات سے مقابل ہوتا رہا ہے۔ یوں کہ کہانی کے اندر کے معنی تہہ در تہہ ہو جاتے ہیں۔ خارجی حقیقت اس کے ہاں ٹوٹ پھوٹ کر بڑی اور ازلی حقیقت میں تحلیل ہو جاتی ہے، محض کہانی لکھنا اشفاق احمد کا مسئلہ نہیں ہے کہ وہ مسلسل زندگی کو بہت گہرے معنی دینے کے جتن کرتا رہا ہے۔ (۴۹)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں انسان کی محرومیوں، نارسائیوں، تکلیفوں اور اذیتوں کو بیان کر کے قارئین

کو اس میں رونے یا بلکنے کے لیے نہیں چھوڑ دیتے بلکہ ان کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور علاج کے طریقے بتاتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد اپنے افسانوں میں معاشرے کے دکھوں اور افراد کے آنسوؤں کو سامنے لاتے ہیں۔ان کے ہاں جذبے اور کیفیات کا حسین سنگم ملتا ہے۔وہ زندگی کی نارسائیوں اور بے بسی پر خود بھی روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رلاتے ہیں۔لیکن یہ اس کے اسلوب کی خوبی ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو نوحہ یا مرثیہ نہیں بننے دیتا اور فکری تجزیوں اور اپنے تخیلاتی زاویوں سے تحریک کی شگفتگی اور حسن کو برقرار رکھنے کا فن جانتے ہیں۔(۵۰)

اشفاق احمد ایک حقیقت نگار افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے محنت کشوں کے حقوق کے لیے جس طرح آواز اٹھائی ہے شاید کوئی بھی محنت کشوں کی حق تلفی کے المیے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا سکا ہو۔افسانہ ''ماسٹر روشی'' کا بابا ابراہیم تیس سال سے چارپائیوں کے پائے بنا کر قوم کی خدمت کر رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں اب موتیا اتر آیا ہے اور اس سے مزید محنت نہیں ہو سکتی اور وہ درخواست کرتا ہے کہ ماسٹر روشی کی طرح اس کا بھی وظیفہ مقرر کروا دیا جائے تا کہ گزر اوقات آسانی سے ہو سکے:

> جناب قوم منجیاں کھاٹاں تیسوندی رہی اے۔۔۔۔اب مجبوری ہے،موتئے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا ہو سکے تو وظیفہ لگوا دیئوں۔۔۔۔میں کہا''یہ کام مشکل ہے تم نے اپنے ذہن سے یا اپنے فن سے یا اپنی فکر سے قوم کی خدمت کی ہوتی تو میں تمہارا کیس لے کر چلتا بھی اور تمہارا قوم پر حق بھی بنتا یہ پاولے بنا کر اور گنڈھے بیچ کر قوم کی خدمت نہیں ہوتی،قوم کی خدمت صرف ذہنی کام کرنے والے کرتے ہیں،بیٹھیں کام کرنے والے نہیں۔(۵۱)

یہاں اشفاق احمد نے ایک طرف یہ کہانی بیان کی ہے ہمارے ہاتھ سے کام کرنے والے محنت کش کی نہ تو عزت ہے اور نہ ہی محفوظ مستقبل۔اسی طرح افسانہ ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' حقیقت نگاری میں تصور محبت کا بہترین افسانہ ہے۔اس افسانے میں ایک طرف اشفاق احمد نے ان امیر کبیر چوہدری لوگوں پر طنز کیا ہے جو غریب لوگوں کے حقوق اور زمینوں پر ناجائز قابض ہو جاتے ہیں اور اپنے اختیارات و تعلقات کی بنا پر عدالتوں سے بھی من پسند فیصلے صادر کراتے ہیں۔دوسری طرف اشفاق احمد نے انسان کی آزادی سے محبت کو بیان کیا ہیں کہ انسان فطری طور پر آزاد پیدا ہوا ہے۔

اس افسانے میں نورے گجر پارٹی نے ماسٹر عبدالودود پر تشدد کرنا شروع کیا کہ وہ کیوں دست بردار ہوا جبکہ اس کے حق میں فیصلہ ہونے والا تھا۔اشفاق احمد لکھتے ہیں:

ماسٹر عبدالودود نے کہا ''میں آزاد ہوں اور اپنے حق پر کسی اور کا قبضہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ میرا حق میرا ہے۔ میں اسے رکھو، چھوڑ دوں، ہبہ کروں، گفٹ کردوں، خیرات کردوں۔۔۔۔ کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ نہ میں کسی کا حق مارتا ہوں نہ کسی اور کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ میرا حق مارے۔ میرا حق میرا ہے، میں اسے جس طرح چاہوں استعما کروں۔ (۵۲)

اشفاق احمد کی حقیقت نگاری میں تصور محبت عیاں ہیں۔ توبہ، رات بیت رہی ہے، شب خون، توتا کہانی، عجیب بادشاہ، بندرابن کی کنج گلی میں، بابا، اجلے پھول، گل ٹریا، تنکہ، حقیقت نیوش، وکھووکھ اور زرناب گل ایسے افسانے ہیں جن میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ محبت کی آمیزش واضح دکھائی دیتی ہے۔

جدید دور میں اشفاق احمد ایسا نام ہے جس نے اپنے افسانوں میں حقیقت اور محبت کو بطور موضوع بیان کیا ہیں۔ ان کی حقیقت پسندانہ محبت عام محبت نہیں بلکہ بڑی خاص گہری اور داخلی محبت ہے جو مجاز سے سفر کرتے ہوئے حقیقت کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اشفاق احمد کی محبت کے لاتعداد روپ ہیں جو مرد عورت کے باہمی تعلقات تک محدود نہیں بلکہ اپنا وجود پھیلائے ہوئے وسیع کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔ ان کے اکثر کردار محبت کے حوالے سے محرومیوں، المیے، انتشار اور معاشرتی مسائل کا شکار ہیں۔ ان کا افسانہ ''مانوس اجنبی'' ایک ایسا افسانہ ہے جس کا ماحول بہت ہی عجیب وغریب ہے۔ اس کے کردار بھی محبت کرنے کے بعد جدا ہو جاتے ہیں۔ وصل کی بجائے، ہجر اشفاق احمد کا موضوع ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو کبھی بھی ملواتے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ جسمانی محبت کی بجائے روحانی محبت پر یقین رکھتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر اشفاق احمد کا افسانہ ''عجیب بادشاہ'' جس میں دو کردار اپنے معاشرے سے بغاوت کر کے چلے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچہ پیدا ہوتے ہی لڑکی مر جاتی ہے اور بعد میں بچہ جب بڑا ہو جاتا ہے تو ماں کی جدائی کا کرب سہ نہیں سکتا۔ وہ شدید بیمار پڑ جاتا ہے اور اس کا باپ اس کا علاج غربت کی وجہ سے نہیں کرسکتا اور وہ مر جاتا ہے۔ کہانی کا ہیرو دکھوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد کا خیال ہے کہ محبت ان لوگوں سے کی جاتی ہے جو دکھی ہیں جو زندگی آسائش سے نہیں گزار سکتے۔ افسانہ ''محسن محلّہ'' میں ماسٹر جی سے اشفاق احمد کو اس لیے محبت ہے کہ وہ دکھوں کا شکار ہے۔ بیماری میں کوئی اس کا پوچھنے والا نہیں ہے لیکن جب وہ مرتا ہے تو سب اس سے محبت جتاتے ہیں ور ہمدردی کرتے ہیں۔ ''افسانہ'' کالج سے گھر تک'' میں ایک غریب کردار ہے جو خواب دیکھتا ہے جو کبھی پورے نہیں ہو سکتے۔

حوالہ جات

(۱)فیروز الغات اردو (جامع)، فیروز سنز لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۷۲

(۲)ایم سکاٹ پیک، محبت کی نفسیات (مترجم): یاسر جواد، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۵

(۳)محمد اقبال، محبت، مکتبۃ الشیخ بہادر آباد، کراچی، س ن ص ۱۱

(۴)ایم سکاٹ پیک، محبت کی نفسیات، (مترجم): یاسر جواد، ص ۶۱

(۵)وزیر آغا، ڈاکٹر، مسرت کی تلاش، اظہار سنز پرنٹرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۴۹

(۶)محبوب عالم، مولوی، (مرتب)، اسلامی انسائکلوپیڈیا، (ترتیب وتدوین): عاصم محمود، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵، ص ۶۱۵

(۷)محبوب عالم، مولوی، اسلامی انسائکلوپیڈیا، ص ۶۱۵

(۸)عبدالکریم، ابوالقاسم، امام، تصوف کا انسائیکلوپیڈیا، (مترجم): محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن، ص ۴۷۷

(۹)تصوف کا انسائیکلو پیڈیا، ص ۴۷۸

(۱۰)محمد اجمل، ڈاکٹر، مقالات اجمل، علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۴۲۸

(۱۱)سمیر حلبی، محبت کی حقیقت، المکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴

(۱۲)سمیر حلبی، محبت کی حقیقت، ص ۲۶

(۱۳)محمد اقبال، محبت، ص ۱۷

(۱۴)سمیر حلبی، محبت کی حقیقت، ص ۲۹

(۱۵)علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۷

(۱۶)مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ ء ص ۲۶

(۱۷)مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، ص ۲۶

(۱۸)علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، ص ۱۳۴

(۱۹)مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت'' ص ۳۱

(۲۰)القران،سورۃ المائدہ، آیت نمبر ۵۴،(مترجم):محمود الحسن،مولانا،تاج کمپنی لمیٹڈ،کراچی، پاکستان،اکتوبر ۲۰۰۲ء

(۲۱)القران،سورۃ البروج،آیت نمبر۱۴

(۲۲)حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات ،مقتدرہ قومی زبان، پاکستان،اسلام آباد ،۱۹۸۵ء،ص ۶۳

(۲۳)محمد اجمل،ڈاکٹر،مقالات اجمل،ص ۳۵۲

(۲۴)شاعر علی شاعر،نیا اردو افسانہ،سٹی بک پوائنٹ اردو بازار،کراچی،۲۰۱۱ء،ص ۵۳۱

(۲۵)محمد اجمل، ڈاکٹر،مقالات اجمل،ص ۳۵۴

(۲۶)محمد ہارون قادر،ڈاکٹر''رومانویت''مشمولہ''خیابان''ششماہی تحقیقی مجلّہ، مدیر:فقیر اخان فقری،ڈاکٹر،شعبہ اردو جامعہ پشاور،شمارہ ۲۳،خزان ۲۰۱۰ء،ص ۵۶

(۲۷)محمد خان اشرف،ڈاکٹر،رومانویت اور اردو اداب میں رومانوی تحریک ،الوقار پبلکشنز، لاہور،۱۹۹۸ء،ص ۱۶

(۲۸)فیروز الدین،مولوی،فیروز اللغات اردو ، فیروز سنز لمیٹڈ،لاہور،۱۹۸۳ء،ص ۷۲۹

(۲۹)محمد ہارون قادر،ڈاکٹر،مشمولہ''خیابان''،ص ۵۷

(۳۰)محمد اشرف خان،رومانویت اور اردو ادب میں رومانوی تحریک،ص ۲۱

(۳۱)سہیل احمد خان،ڈاکٹر،منتخب ادبی اصطلاحات،شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی،لاہور،۲۰۰۵ء،ص ۱۷۱

(۳۲)علی عباس جلالپوری،خردنامہ جلالپوری،تخلیقات لاہور،۲۰۰۶ء،ص ۱۶۶

(۳۳)عبادت بریلوی،ڈاکٹر،افسانہ اور افسانے کی تنقید ،ناظم ادارہ ادب وتنقید لاہور،۱۹۸۶ء،ص ۱۵۲

(۳۴)سلیم آغا قزلباش،جدید اردو افسانے کے رجحانات ،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی ،۲۰۱۰ء،ص ۹۸

(۳۵)سلیم آغا قزلباش،جدید اردو افسانے کے رجحانات، ص ۱۰۲

(۳۶)محمد ہارون،ڈاکٹر،مشمولہ،خیابان،ص ۶۷

(۳۷)انور سدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں ،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۱۹۹۶ء،ص ۴۳۲

(۳۸)انورسید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں ،ص۴۳۷

(۳۹)انورسید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں ،ص۴۳۹

(۴۰)انورسید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،ص۴۳۹

(۴۱)شاعرعلی شاعر،نیا اردو افسانہ،ص۴۱۵

(۴۲)حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز،کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۷۰

(۴۳)علی عباس جلالپوری،خردنامہ جلال پوری،تخلیقات لاہور،ص۱۳۶

(۴۴)سلیم آغا قزلباش،جدید اردو افسانے کے رجحانات،ص۱۱۶

(۴۵)غلام حسین،ڈاکٹر،اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ ،منظورشدہ مقالہ پی ایچ ڈی(اردو)،شعبہ اردو،سندھ یونیورسٹی،۱۹۷۵ء،ص۴۷۹

(۴۶)انورسدید،ڈاکٹر،اردو ادب کی تحریکیں،ص۵۰۵

(۴۷)۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردوافسانہ اورافسانہ نگار،اردواکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۸۲ء،ص۱۷۷

(۴۸)۔انورسدید،ڈاکٹر،اشفاق احمدمجسم لطافتوں کاافسانہ نگار،مشمولہ:اردوافسانے کی کروٹیں ،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۹۱ء،ص۱۳۹

(۴۹)۔محمد حمید شاہد،اردوافسانہ:اہم نشانات،مشولہ:اردوافسانہ۔صورت مفی،انتخاب وترتیب:سین آفاقی،نیشنل بک فاؤڈیشن،اسلام آباد،جولائی ۲۰۰۶ء،ص۱۱۸

(۵۰)۔محمد عالم خان،ڈاکٹر،قیام پاکستان کے بعد چندنمایاں رجحانات،مشمولہ:اردوافسانے میں رومانوی رجحانات،علم وعرفان پبلشرز،لاہور،۱۹۹۸ء،ص۴۸۰

(۵۱)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،ماسٹر روشی،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۱۰۷

(۵۲)۔اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،قصہ شاہ مراداورایک احمق چڑیا کا،ص۲۳۰

باب دوم

اشفاق احمد کے افسانوں میں شخصی محبت کا تصور

(ا) انسان سے محبت کا تصور:۔

انسان سے محبت کا تصور اکثر رومانوی شعراوادباء کا خاصا رہا ہے۔رومانوی شعراء اور فکشن نگاروں نے اپنی اپنی تحریروں میں محبت کے تصور کا انوکھا اور الگ رنگ پیش کیا ہیں۔اردو افسانوی ادب میں جہاں یلدرم، نیاز فتح پوری، امتیاز علی حجاب وغیرہ نے اپنے افسانوں میں محبت کے متنوع رنگ بیان کئے ہیں وہاں اشفاق احمد کے افسانوں میں بھی محبت کے مختلف تصورات موجود ہیں جیسا کہ انور سدید لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد کے ہاں معمولی چیز کو بھی غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ان کے ہاں کوئی جذبہ کمزور یا معمولی جذبہ نہیں ہے وہ چھوٹے سے واقعے میں بھی ایک بڑی کہانی کا عنصر دیکھ لیتا ہے اور اسے اپنے فکر ونظر کے مطابق ایک جیتی جاگتی اور موثر کہانی کا روپ دے سکتا ہے۔(۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو''چھوٹے سے واقعہ میں بڑی کہانی کا عنصر تو دیکھ لیتے ہیں لیکن''جیتی جاگتی اور مئوثر کہانی'' کہنے کے ڈھنگ سے واقفیت نہیں رکھتے اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں''جو کہانی کہنے'' کے طریقے سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن''کہانی اخذ کرنے'' کے لیے جس قوت مشاہدہ اور غور وفکر کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محروم ہوتے ہیں۔لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بصیرت جیسی نعمت سے نوازا ہے کہ اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات میں سے کہانیاں اخذ کر سکیں اور ان کے پاس فنی مہارت بھی ہوتی ہے۔کہ ذہن میں پیدا ہونے والی کہانی کو موثر انداز میں بیان کر سکیں اور یقیناً اشفاق صاحب ان موخرالذکر لوگوں میں سے ہیں، جن کے ہاں فن کی گہرائی اور فکر کی بلندی دونوں موجود ہیں۔

اشفاق احمد کے ہاں بنیادی اور مرکزی جذبہ''محبت'' ہے۔اور اس کے متنوع روپ ہیں جن سے ان کے اکثر افسانے جنم لیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں محبت ایک عظیم کائناتی سچائی کی شکل میں ابھرتی ہے۔اشفاق احمد کے افسانوں کا سب سے اہم اور بنیادی موضوع صرف''محبت'' ہے جس کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد نے کسی ماحول کو منتخب کرنے کی بجائے ایک موضوع کو اپنے لیے منتخب کر لیا ہے اور اسے منتخب کر کے مختلف فضاؤں میں اس موضوع کو مختلف صورتیں اختیار کرتے دکھایا ہے۔یہ موضوع''محبت'' ہے۔(۲)

اشفاق احمد اس پختہ یقین کو بار بار دہراتا ہے کہ محبت ہی وہ اسم اعظم ہے جو انسان پر ذات اور کائنات کے بند دروازے کھول سکتا ہے۔گویا جو کچھ بھی ہے محبت کا پھیلاؤ ہے۔اس کے ایک افسانے''ماسٹر روشی'' میں ایک جگہ انجیل کے حوالے سے یہ بات لکھی گئی ہے''اگر میں سارے جہاں کی بولیاں بولوں اور تمام دنیا کے علم حاصل کر لوں، لیکن محبت نہ کروں تو ٹنٹھنا تا ہوا پیتل اور جھنجھناتی ہوئی جانجھ ہوں''(۳)

انسان سے محبت کا تصور اشفاق احمد کے تقریباً تمام افسانوی مجموعوں میں عیاں ہیں۔ان ہی افسانوی مجموعوں میں سے ''اجلے پھول'' ایک مجموعہ ہے جس میں افسانہ ''گڈریا'' تقسیم کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس کا بنیادی موضوع محبت ہے جو کسی خاص بندے سے نہیں بلکہ انسانیت سے محبت ہے۔اس میں ایک کردار ''داؤ جی'' کے گرد سارا افسانہ گھومتا ہے۔اس افسانے کی بنیاد ہندو مسلم خاندانوں کے درمیان رشتہ محبت پر ہے۔داؤ جی کا کردار اپنے اندر اعلیٰ انسانی اقدار کو سمیٹے ہوئے ہیں۔پرخلوص دوستی، وفا، بے لوث خدمت، دوسروں کا احترام اور احسان مندی کا شدید جذبہ وغیرہ، وہ اپنی محدود زندگی میں ان تمام خصوصیات کو بروئے کار لاتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں مرد، عورت، جوان، بوڑھا، چھوٹے معصوم بچے اور بے زباں جانوروں سے تصور محبت کے مختلف روپ پیش کر کے ہر پڑھنے والے کو متاثر کیا ہے۔عورت سے مرد کی اور مرد سے عورت کی محبت کا جذبہ فطری ہے۔

افسانہ ''گل ٹریا'' کے استعارے میں ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو چاہتی کسی اور کو ہے اور بیاہی کسی اور جاتی ہے۔اس میں ایک نوجوان (بھیا) ''ت'' نامی لڑکی سے محبت کرتا تھا لیکن چونکہ وہ ابھی نوجوان ہے اور پڑھ رہا ہے ''ت'' کو باوجود یقین دہانی کرنے کے اس کی دولت سے پیار نہیں ہے کسی اور سے شادی کر لیتی ہے:

> اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور میرے چھلے کو میری انگلی میں گھمائے جاتی تھی میں نے پڑھنا بند کر کے کہا ''زیور عورتوں کی جان ہوتا ہے دیکھو تم کس محبت اور شوق سے چھلے کو گھما رہی ہو اور تمہیں شاید اس کا علم بھی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو'' اس نے برا مان کر ہاتھ روک لیا اور میری طرف منہ کر کے بولی۔''تم سمجھتے ہو، میں ہر انگلی کے چھلے کو اس طرح گھماؤں گی کیونکہ میں عورت ہوں اور عورت کو زیور عزیز ہوتا ہے'' میں نے ڈرتے ہوئے کہا ''ہاں'' ''ت'' نے کہا ''خیر ہم ایسے کنگال بھی نہیں۔میں نے ایسے بہت سے چھلے دیکھے ہیں، لیکن انہیں اس طرح پھرانے کی تمنا کبھی میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی'' پھر وہ ذرا رک کر بولی'' اگر اس انگلی میں گھاس کا چھلا بھی ہوتا تو بھی میں اس شوق سے گھماتی (۴)

افسانہ ''گل ٹریا'' میں اشفاق احمد نے معاشرے کے بعض امیر لوگوں سے رشتے نبھانے والوں پہ طنز کیا ہے۔اس افسانے میں ''ت'' ایک ایسی لڑکی ہے جو ایک پڑھنے والے طالب علم سے محبت کرتی ہے مگر اس کے والدین اسے کمانے والے مرد سے بیاہ دیتے ہیں اور وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی:

> ''ت'' سرخ رنگ کی مسالہ ٹکی اوڑھنی اوڑھے عورتوں کے جلو میں کھڑی ہے۔بروکیڈ کی اچکن والا پھولوں کی لڑیاں ایک طرف ہٹا کر کار کا دروازہ کھول رہا ہے اور گل ٹریا بڑے حجاب اور بڑی لیک

کے ساتھ اندر داخل ہو رہی ہے۔اس نے سر جھکا کر کار میں ایسے قدم رکھا جیسے وہ بھیا کو جانتی ہی نہیں۔(۵)

اشفاق احمد نے عورت سے محبت کا جو تصور اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ اپنے سماج سے اخذ کردہ تصور محبت ہے کیونکہ سماج کسی بھی تخلیق کار کے لیے تخلیق کا ماخذ بنتا ہے۔معاشرے میں جو ماحول بنا ہوتا ہے کوئی بھی ادیب اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس لیے ہر ادیب اور تخلیق کار کی نظریں اپنی سماج اور ماحول پر رہتی ہیں۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''مسکن'' ایک مکمل بیانیہ افسانہ ہے۔اس افسانے میں دو ہی کردار ہیں جس کے گرد کہانی کا تانا بانا گھومتا ہے۔کہانی کا مرکزی کردار ''میں'' ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جو ماضی کی یادوں میں کھویا رہتا ہے اور اپنی محبوبہ کے کھونے کا غم سینے سے لگائے رکھتا ہے۔

افسانے کا دوسرا کردار ایک لڑکی کا ہے جو کہ متوسط گھرانے کا فرد ہے۔اپنے عاشق سے بہت پیار کرتی ہے اور اس کی سالگرہ کے موقع پر اس کے کالر کے نیچے پھول اور اپنے نام کا پہلا حرف لکھ کر لوٹ آتی ہے۔

> اگر شام کو برش کرنے کے دوران میں میرے سیاہ کوٹ کا کالر نہ الٹ جاتا جہاں ریشم کے زرد تاگوں میں سے ایک ننھا سا نرگس کا پھول کڑھا ہوا تھا، جس کے نیچے تمہارے نام کا پہلا حرف بھی کشیدہ کیا ہوا تھا۔وہ پھول تو شاید اس قدر خوبصورت نہ تھا جس قدر حسین اس کا سہارا تھا۔مجھے سالگرہ کا اس سے بہتر کوئی تحفہ نہ ملا تھا اور نہ آئندہ توقع تھی۔(۶)

اشفاق احمد کا افسانہ ''امی'' میں ایک کردار بھی ''امی'' کے نام سے ہے امی محبت کی علامت ہے اسے ''مسعود'' میں بیٹے کی شبیہ نظر آتی ہے۔وہ نہ صرف اپنے بیٹے سے بہت محبت کرتی ہے بلکہ دیگر جاننے والوں سے بھی اتنی ہی محبت کرتی ہے۔مسعود سے وہ اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہے۔جب امی کو گل ریز کا خط آتا ہے اور پیسوں کا تقاضا کرتا ہے تو امی مسعود کو وہ خط نہیں دکھاتی کہ اسے مفت میں تکلیف ہوگی۔وہ اپنے تمام غم خود تک محدود رکھتی ہے اور دوسروں کے لیے صرف محبت کا استعارہ ہوتی ہے۔

اشفاق احمد ایک ماہر نفسیات ہیں۔وہ ہر ایک افسانے میں تصور محبت کا ایک نیا جہت سامنے لا کر پیش کرتا ہے۔مثلاً افسانہ ''شب خون''، جس کا مرکزی کردار ''شقو'' ہے ''شقو'' کو اشفاق احمد نے نہایت خوبصورتی اور مہارت سے تراشا ہے اور اس کا مکمل ذہنی و نفسیاتی تجزیہ کر کے دکھایا ہے۔

''شقو'' مرض الموت ٹی بی میں مبتلا ہے۔موت کے دھانے پر کھڑا ہے ایسی حالت میں ایک طرف تو وہ موت اور حالات سے سمجھوتہ کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف صحت مند رہنے کی آرزو نے بھی اسے شدید کشمکش

سے دوچار کر رکھا ہے۔ ''شقو'' اپنی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے اور اس مایوسی نے اس کے دل میں زندگی کے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے اب وہ کسی کو بھی بھرپور زندگی کا حامل نہیں دیکھ سکتا ''شقو'' کو ہسپتال کی ایک نرس ''بیٹرس'' سے محبت سی ہونے لگتی ہے لیکن اپنی جھنجھلاہٹ اور انتشار کی وجہ سے اس کی صحت سے جلتا بھی ہے:

> اس کے سرخ اور رسیلے ہونٹ، صحت منداور جان فزا جسم، خون کی حدت سے تمتمایا ہو چہرہ اور جوانی بھری انکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ کر بھرے تھے، آج اسے بہت بری لگیں۔ پہلی مرتبہ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ بیٹرس کا وجود اسے ایک گالی کی طرح دکھائی دینے لگا جو دنیا کے تندرستوں نے مریضوں کو دی ہو۔ نہایت ہی بھیانک اور حد درجہ ہتک آمیز! ہر نرس ایک گالی ہے گالی۔ (۷)

افسانہ ''شب خون'' میں بیٹرس'' ایک سراپا محبت کرنے والا فرشتہ صفت کردار ہے۔ ''بیٹرس'' شقو سے زیادہ ہمدردی رکھتی ہے کیونکہ وہ اسے صحت مند دیکھنا چاہتی ہے۔ ''شقو'' کی زندگی بچانے کے لیے دو دفعہ خون بھی دیتی ہے۔ اشفاق حمد نے بیٹرس جو کہ ایک نرس ہے یہ حقیقت لانے کی کوشش کی ہے کہ ایک عورت جو اپنے پیشے کے ساتھ ایک عورت کا دل بھی اس کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ اس میں چاہے جانے کی خواہش موجود ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''توبہ'' خوبصورت رومانی احساسات سے بھرپور افسانہ ہے افسانے کا مرکزی کردار ''اعجاز'' ایک لاابالی اور عاشقانہ مزاج رکھنے والا جوان ہے۔ وہ زندگی کے میدان میں ایک اچھا جواری ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے سگریٹ کے معاملے وہ اپنے ماں باپ سے ہمیشہ جیت جاتا ہے، ماں باپ ان کو سگریٹ سے منع کرنے کی بہتیرا کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اعجاز کے کان پر جوں ہیں نہیں رینگتی۔ یہی اعجاز ایک عورت سے محبت کے معاملے میں ہار جاتا ہے۔ ایک دن جب ''لیکھا'' کو سگریٹ پیتے ہوئے دیکھتا ہے تو ہمیشہ کے لیے سگریٹ پینے سے توبہ کر لیتا ہے۔ انسانی نفسیات ہے کہ وہ اپنے کسی عزیز کو کسی بری عادت میں مبتلا ہونے نہیں دیکھ سکتا۔

''اعجاز'' نے ''لیکھا'' کے پیتے ہوئے سگریٹ کو رومال میں لپیٹ کر اپنے کوٹ کے جیب میں رکھ لیا۔ یہ بھی محبت کا ایک انوکھا انداز ہے:

> کارک والی جگہ گیلی تھی۔ میں نے اسے ہونٹوں میں دبایا۔ کش نہیں کھینچا اور پھر سگریٹ بجھا لیا اور رومال میں لپیٹ کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پاسنگ شو کے باقی ماندہ سگریٹ معہ ڈبیا مروڑ تروڑ کر جعفری کے موکھے میں سے دور دور تک پھیلی ہوئی دودھیا چاندنی میں پھینک دیے۔ (۸)

اشفاق احمد کا افسانہ ''رشوت'' ایک طرف جاگیردرانہ سوچ کی عکاسی لیے ہوئے ہے تو دوسری طرف مرکزی کردار ''شدین'' گاؤں کی ہرخوبصورت ،نوجوان مٹیار سے محبت رچاتا ہے، دو مہینے ساتھ رکھتا ہے اور پھر اس کو چھوڑ کر کسی اور کو ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔شاداں پر آنکھ ٹھہرتی ہے:

> ایک بار کپاس کے کھیت میں جب اس نے شاداں کو چھیڑا تو وہ متھے تے ہٹ پا کر اکھن لگی ۔۔۔۔''نابابا! تیرا کیا بھروسا۔اج سچ تکا کے خوش کرتا ہے۔کل کھائی میں دھکا دے دیتا ہے ۔تمہاری یاری کا کیا اعتبار۔۔۔۔۔۔اللہ کرے میری تیری کدی نہ لگے''۔۔۔۔ ہر شاداں بھولی مٹیار تھی شدین کی وارتا میں اگئی اور وہ ہر روز نیائیں میں ایک دوسرے سے ملنے لگے۔(۹)

محبت اشفاق احمد کے ہاں ایک طاقتور جذبہ ہے جس سے بڑے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ان کے ہاں محبت ایک ایسا محرک ہے جو انسان کے اندر نیکی اور خیر کو تحریک دیتا ہے اس کے اندر کی برائی کو کہیں پیچھے دھکیل کر نیکی اور اچھائی اس پر غالب کر دیتا ہے۔بقول ڈاکٹر سلیم اختر ''اشفاق احمد کے ہاں محبت ایک ایسی قوت ہے جو فرد کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔''(۱۰)

اشفاق احمد مثبت سوچ کے حامل افسانہ نگار ہیں انہیں ہمیشہ برائی کے پردے میں اچھائی نظر آجاتی ہے۔ وزیر آغا لکھتے ہیں ''اشفاق احمد طبقاً ہر ادارے ،نظریے یا شخص کے مثبت پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔''(۱۱)

افسانہ ''خانہ خراب'' میں اشفاق احمد نے عورت سے محبت کے تصور کا ایک عجب انداز پیش کیا ہے۔جس میں ایک شخص ''سمندی'' جو کہ سزا یافتہ ہے اور حال ہی میں جیل سے آیا ہے اپنے دوست ڈاکٹر کمال سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس کی محبت ضرور دلوائے گا لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دوست کی محبت وہی لڑکی ہے جس پر وہ خود مرتا ہے لیکن وہ وعدہ نبھانے کو اور دوستی کی لاج رکھنے کو اپنے دوست ڈاکٹر کمال کو اپنی محبت حوالے کر دیتا ہے اور دوست کو خبر تک نہیں ہونے دیتا:

> ''کمال نے حیران ہو کر پوچھا'' گاؤں نہیں جا رہے ہو؟ سمندی نے مہار کو پورے زور سے گھما کر ڈاچی کی گردن پر مارتے ہوئے کہا'' گاؤں میں اب میرا کون رہ گیا ہے۔''(۱۲)

اشفاق احمد نے جہاں اپنے افسانوں میں عورت سے محبت کے تصورات کو بیان کیا ہے وہاں مرد سے عورت کی محبت کو اجاگر کیا ہے۔اشفاق احمد سماج کے اندر رہتے ہوئے دلوں کی دھڑکن محسوس کرنے والے افسانہ نگار ہیں ۔مرد سے محبت کے تصور کو انہوں نے ''دکھودکھ'' جیسے شاہکار افسانے میں انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ۔اس افسانے میں دو مرکزی کردار ایک ''میں'' واحد متکلم اور دوسری اس کی محبوبہ ریحانہ ہے۔دو کردار اپنی اپنی جگہ

وقت کے ساتھ اپنے ماحول کا حصہ بن چکے ہیں۔کردار ''میں'' ریحانہ کو دل و جان سے چاہتا ہے لیکن دونوں کا ایک ہونا مقدر نہیں ہوتا اور ریحانہ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی ہے۔اسی طرح ''میں'' بھی کسی اور کے حصے میں آجاتا ہے اشفاق احمد لکھتے ہیں ''پورے انتالیس سال گیارہ مہینے آٹھ دن اور پانچ گھنٹے کے وقفے بعد وہ میرے سامنے ٹینٹ والوں کی نواڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔''(۱۳)

گویا طویل عرصے کے بعد ان کی ملاقات ہوتی ہے۔انسان جدائی میں مرنے پر قادر نہیں ہوتا اور زندگی کے دن رات کو بناتے رہنا اس کا مقدر ہوتا ہے لیکن اس کی روح ہمیشہ اسی روح سے جڑی رہتی ہے جو اس کی پہلی محبت ہوتی ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کبھی اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کرسکتا۔''ریحانہ'' بھی واحد متکلم ''میں'' سے بے تحاشا محبت کرتی ہے، ڈرپوک سی لڑکی ہوتی ہے اور کسی حد تک احمق بھی، احمق ہونا اس کے مخلص اور محبّ ہونے کی علامت ہوتی ہے:

> ''ریحانہ نے ڈیوڑھی میں آکر پھیری والے سے کہا ''بھائی آٹھ آنے گز قیمت زیادہ بتلانا،
>
> امی ضرور قیمت کم کریں گی، مجھے بار بار چکر لگانے پڑیں گے۔تمہارا بھی نقصان ہوگا۔''(۱۴)

مرد سے تصورِ محبت کے حوالے سے افسانہ ''برکھا'' ایک اہم افسانہ ہے جس میں مرکزی کردار ''ثریا'' ہے جو پوری کہانی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔''ثریا'' ایک چپ رہنے والی ڈرپوک سی لڑکی ہے جو ایک نوجوان سے محبت کرتی ہے اور دل ہی دل میں اسے پوجتی ہے لیکن اپنی شرم و حیا اور معاشرتی پابندیوں کی وجہ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کرسکتی اور اس میں کچھ کہنے کی ہمت اور حوصلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اس نوجوان کو کھو دیتی ہے اور گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے:

> کھانا کھا چکنے کے بعد جب دونوں سہیلیاں امینہ کے سونے والے کمرے میں ٹیبل فین کے سامنے
> آبیٹھیں تو ثریا نے کہا: ''لطیف صاحب تو ایسے گورے نہیں پر وہ اتنا سفید ہے جیسے روئی کا گالا
> ۔لڑکے اتنے گورے اچھے نہیں لگتے۔نہیں لگتے ناں ؟''اس نے امینہ سے تصدیق کرانی چاہی
> ۔(۱۵)

اشفاق احمد کا افسانہ ''بابا'' ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں ''ایلن'' ایک محبت کرنے والی، وفا شعار بیوی ہے۔اپنی محبت کی خاطر اپنا ملک، اپنا خاندان سب کچھ چھوڑ کر ''وحید'' سے شادی کر کے اس کے گاؤں آکر زندگی گزارنے لگتی ہے۔وہ وحید سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔اس کی زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ وحید کی محبت ہی ہوتی ہے:

ٹھیک ہے شامت تو آئے گی اور جب اس کا آنا لازمی ہے تو ہم تردد کیوں کریں۔ آؤ ایک بار پھر سو جائیں۔ جب دوبارہ اٹھیں گے تو شامت آ کر چلی بھی گئی ہوگی ایلن نے شال پرے کھینچ کر کہا ۔''نہیں بھئی اٹھو اب میں تمہیں سونے نہ دوں گی ۔ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا روشندانوں سے اندر گھس آیا اور باہر ٹپاٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔(۱۶)

افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں ''سیما'' کو ''زمان'' کی جوانمردی اور خودداری پسند ہے اور اس سے محبت کرنے لگتی ہے جب ''زمان'' کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اسے کالج آنے سے منع کرتی ہے اور گھر سے بھاگ کر زمان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ انتہائی غربت کے دن ''زمان'' کے ساتھ گزارتی ہے:

شام کو ہم کرکٹ گراؤنڈ سے پرے درختوں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ سیما نے کہا ''زمان'' اگر میں تم سے ایک چیز مانگوں تو دو گے۔؟ میرے منہ سے پتہ نہیں کیوں ''ضرور'' نکل گیا اس نے روہانسی ہو کر کہا ''مجھے اپنی زندگی دیجیے!'' میں نے بازو پھیلا کر جواب دیا ''لے لو'' پھر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور ہاتھ باندھ کر بولی ''یہاں سے چلے جایئے اپنے گاؤں یا کہیں اور۔ وہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے۔(۱۷)

اشفاق احمد کا افسانہ ''توتا کہانی'' ایک مکمل رومانوی افسانہ ہے جس میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی بھی موجود ہے۔ بنیادی طور پر ایک عورت کے دل کے اندر مرد کے لیے ایک فطری محبت اور کشش موجود ہوتی ہے ہر لڑکی کے ذہن میں ایک سپنوں کا راج کمار ضرور ہوتا ہے لیکن مرد کے مقابلے میں عورت ذات کے لیے محبت کا اظہار کرنا کافی مشکل ہے۔

معاشرتی پابندیاں خصوصی طور پر اس کے پاؤں میں زنجیر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے افسانہ ''توتا کہانی'' میں ''خجستہ'' حامد سے محبت کرنے کے باوجود ایک مجبور اور بے بس لڑکی ہے۔ وہ بہانے بہانے سے چھت پر کسی نہ کسی طریقے سے اپنی محبت ''حامد'' پر ظاہر کرتی ہے لیکن کھل کر اظہار اس کے لیے ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ذہنی کشمکش کا شکار ہے۔ مقبرہ جہانگیر میں حامد سے ملاقات کے بعد کسی حد تک اس کا ڈر ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی محبت کے لیے جان دینے کو تیار ہو جاتی ہے:

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں سیڑھیوں سے قدموں کو چاپ اور پھولے ہوئے سانسوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اس کی گود میں سے سر اٹھا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے اس کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں میں سکون اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی ۔اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کہا ''یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے اور میری زندگی ختم کرنے کے لیے کافی

ہوگی۔اس طرح میں اپنی امی اور اپنی پھوپھی کی طعن آمیز باتیں سننے سے بچ جاؤں گی۔(۱۸)

فطرت سے محبت انسان کی گھٹی میں پڑی ہے۔انسان کائنات کے مختلف مظاہر سے انس رکھتا ہے ۔مثلاً قدرتی مناظر،وطن سے محبت ،پہاڑوں ،دریاؤں ،سرسبز وشاداب وادیوں ،گھنے جنگلات وغیرہ سے محبت انسان کی ابتداء ہی سے چلی آرہی ہے۔لیکن بالخصوص ایک ادیب ان چیزوں سے محبت کو ایک الگ آنکھ سے دیکھتا ہے۔

فطرت کا دوسرا نام تخلیق ہے۔معروف ماہر نفسیات ایم سکاٹ پیک فطرت کو تخلیق کا مترادف قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں''فطرت جسے ہم کبھی کبھی''تخلیق'' کا نام دیتے ہیں''(۱۹)

فطرت سے محبت کے حوالے سے اردو ادب میں متعدد شعراء اور ادباء نے پڑھنے والوں کے لیے بہت کچھ لکھا ہیں۔جہاں شعراء نے اپنی نظموں میں قدرتی مناظر،تاریک راتوں کی خاموشی ،سمندروں اور دریاؤں کی روانی ،پرندوں کی چہچہاہٹ اور سریلی آوازیں،وطن کی خوبصورتی وغیرہ کو تحریر میں لایا ہے وہاں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے ان محبتوں کو سحر انگیز کہانیوں کی صورت میں بیان کیا ہیں۔

اشفاق احمد نے افسانہ''فہیم''میں نیچر سے محبت کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔اس افسانے میں بارش کے برسنے،برساتی نالوں کا شور،بجلی کی کڑک اور پہاڑ کی چوٹی کے خوبصورت اور دلکش مناظر پیش کر کے قاری میں فطرت سے محبت کا جذبہ ابھارا گیا ہے:

> باہر بڑے زور کی بارش ہورہی تھی۔برساتی نالوں کا شور بڑھ گیا تھا اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا چنگھاڑنے لگی تھی۔بادل شدت سے دھاڑا۔بجلی کا ایک کوندا تیزی سے لپکا اور پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر چیل کے ایک جھنڈ سے ایسے پٹاخے چھوٹے گویا مشین گن چل گئی ہو۔(۲۰)

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کے متنوع رنگ پائے جاتے ہیں۔کسی بھی افسانے کو پڑھنے سے قاری ایک خاص قسم کا حظ محسوس کرتا ہے۔ان کے افسانے زندگی اور انسانوں سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ڈاکٹر شفیق انجم اشفاق احمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد کے افسانوں کا مرکزی موضوع محبت کا بنیادی اور جبلی جذبہ ہے جو نئی جہتوں اور نئے زاویوں کے ساتھ ان کے افسانوں میں دریافت ہوا۔محبت کا تصور ان کے ہاں سطحی ہے اور نہ قنوطی۔اس کے برعکس اس میں بڑی وسعت،تنوع اور گہرائی ہے۔ان کے افسانے قاری کو ملول نہیں کرتے،نہ ہی دل گرفتہ کرتے ہیں بلکہ یہ زندگی اور انسانوں سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔۲۱

اشفاق احمد کے افسانے موضوعات کی شرینی، لطافت اور دلچسپی کے علاوہ اس لیے بھی پڑھنے والے کو متاثر کرتے ہیں کہ ان کی پوری فضا میں ایک شگفتگی ہے۔ وہ سیدھی سادی بات کو ایسے شاعرانہ انداز میں کہنے کے عادی ہیں کہ کبھی کبھی یہ سیدھی سادی بات کو افسانے کی بجائے کسی حسین نظم کا موضوع معلوم ہونے لگتی ہے۔

اشفاق احمد کا فطرت سے محبت رکھنے والا افسانہ ''تو تا کہانی'' بھی ہے۔ اس فسانے کا آغاز بھی انتہائی خوبصورت منظر سے کیا گیا ہے جس طرح رومانوی شعراء نیچر کو دلفریب انداز میں بیان کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اشفاق احمد بھی ساحرانہ انداز میں فطرت کے ان گوشوں کو قاری کے سامنے لاتا ہے۔ وہ قدرتی مناظر کو کہانی کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیتے ہیں کہ قاری خود کو کہانی کا ایک حصہ سمجھنے لگتا ہے:

> ایک دن کاشی کی سمت سے آنے والے بادل نہ جانے ادھر کیسے چلے آئے کہ سارا شہر اندھیارے کی لپیٹ میں آ گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہم چاروں دوست ہوٹل کے ایک کمرے میں سٹو و لیمپ کے اردگرد کیتلی سے اٹھتی ہوئی بھاپ میں اپنے سگریٹوں کا دبیز دھواں ملا ملا کر نظارہ کر رہے تھے۔ سخت سردی میں ایسی شدید بارش کھڑکی کے شیشوں پر پتہ نہیں کونسی گت بجا رہی تھی (۲۲)۔

مسئلہ کشمیر پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد سے چلا آ رہا ہے۔ مختلف ادیبوں اور تاریخ دانوں نے کشمیر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہیں۔ کشمیر کی خوبصورتی کو ساری دنیا نے تسلیم کر لیا ہے کہ کشمیر جنت نظیر ہے۔ اس سلسلے میں اشفاق احمد نے ایک افسانہ ''بندر لوگ'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ بظاہر اس افسانے میں بندر کو انسانی پستی کا استعارہ دکھا کر بھارتی جارحیت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کیونکہ اشفاق احمد پاک بھارت ابلاغ کی جنگ میں ایک بہت اہم شخصیت رہے ہیں اور آزاد کشمیر ریڈیو کے انتہائی ہر دلعزیز براڈ کاسٹر رہ چکے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اشفاق احمد نے اس افسانے میں فطرت سے محبت کے عنصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے اور کشمیر کی قدرتی خوبصورتی اور دلکشی کو انتہائی خوبصورت انداز میں پیرائے میں لایا ہے:

> یہ ۵۱ء کی سردیوں کا ذکر ہے میں آزاد کشمیر جانے کے لیے مری کے پہلو سے گزرا تو سڑک پر جا بجا سفید برف کے گولے پڑے تھے جیسے تھکا ہوا ڈھگا منہ سے جھاگ کراتا جاتا ہے۔ جھیکا گلی کے پاس میں نے سڑک کے دونوں طرف اور ٹین کی چھتوں پر پہلی مرتبہ برف کو اور دوسری مرتبہ بندروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کو دیکھا جو بڑی خاموشی کے ساتھ یاتریوں کی طرح ترائی سے نیچے اتر رہا تھا۔ (۲۳)

اشفاق احمد کے ہاں فطرت سے محبت کا احساس ہمیں افسانہ ''بابا'' میں بھی نظر آتا ہے۔انہوں نے وحید کی فطرت پسندی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان چاہے جتنی ترقی کر لے لیکن آخر کار اسے فطرت کی طرف دوبارہ مراجعت کر کے فطرت کا حصہ بن کر ہی سکون ملتا ہے کیونکہ زندگی کی اصل خوبصورتی کو روح سے محسوس کرنے اور خدا کے نزدیک ہونے کا ذریعہ صرف اور صرف فطرت ہے۔ پرانے زمانے کے انسان کے مادی مسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔اس لیے کہ وہ فطرت سے محبت کرتا تھا اور اس فطری زندگی میں ایک روح پرتھا۔اشفاق احمد نے بھی اس افسانے میں وحید کی ہو بہو وہی تصویر کھینچی ہے جو کہ مادی دور سے نکل کر فطرت کی طرف سفر کر کے اپنے کھوئے ہوئے آدرش کو پانا چاہتا ہے۔

(ب):محبت،جنس اور جذبات نگاری:۔

اردو افسانوی ادب میں جنس کا موضوع کثرت الاستعمال میں پایا جاتا ہے اور اکثر افسانہ نگاروں نے جنس کے متعلق افسانے لکھے ہیں لیکن سب سے پہلے یہ جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ جنس کے معنی کیا ہے۔؟اور جنس سے کیا مراد ہے؟ جنس کی تعریف کے حوالے سے صلاح الدین درویش نے ''اردو افسانے کے جنسی رجحانات'' میں یوں لکھا ہے:

> اردو زبان میں لفظ ''جنس'' کا استعمال بہت محدود معنوں میں اس کی لغات میں آیا ہے ۔مثلاً فرہنگ آصفیہ میں لفظ جنس سے مراد ذات ،قماش ،نوع ،اور صنف ہے اسی طرح ''نسیم اللغات'' اور ''فیروز اللغات'' میں بھی قریباً یہی معنی دیے گئے ہیں۔اس لفظ کے وسیع تر استعمال کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا جبکہ انگریزی کی تمام ڈکشنریوں میں لفظ جنس (یعنی sex) وسیع تر مفہوم میں لیا گیا ہے۔(۲۴)

جنس کی تعریف کے بارے میں Oxford کی ڈکشنری میں لفظ(Sex) یعنی جنس کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

> "The distinction between male and female in general in recent use :the sum of those differences in the Structure and funnction of the reproductive argans on the ground of which beings are distinguished as male and female."(25)

یعنی عموماً جنس سے مراد مذکر اور مونث میں تمیز کرنا ہے لیکن علم سماجیات میں جنس سے مراد یہ نہیں بلکہ مختلف ہے جس کو صلاح الدین درویش نے یوں لکھا ہے:

> علم سماجیات کی رو سے حیاتیاتی اعتبار سے مذکر اور مونث میں کی جانے والی تقسیم کی بناء پر تمام معاشروں میں ان کے مختلف رویوں کے حوالے سے الگ الگ کرنا، مذکر اور مونث کرداروں کا جنسی رشتہ دراصل ایک سماجی رشتہ ہوتا ہے جبکہ حیاتیاتی جنسی ضروریات کے عمل کے ساتھ اس کا تعلق جزوی ہوتا ہے۔(۲۶)

جنس کے موضوع پر علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب جنسیاتی مطالعے میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ قدمائے یونان کے یہاں جنس سے محبت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ نوجوانوں کی مناسب پرورش اور تربیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ آپس میں محبت کریں وہ لکھتے ہیں:

> افلاطونی یا ہم جنسی عشق کی روایت یونانی الاصل ہے۔ قدمائے یونان کے یہاں عشق صادق خالصتاً ہم جنس ہوتا ہے۔ یورپ کے ادباء اور شعرا نے غلطی سے مرد اور عورت کے ایسے عشق کو افلاطونی کہنا شروع کیا جس میں عشاق پاک باز ہوں۔ فی الحقیقت افلاطونی عشق سے مراد ہم جنسی محبت تھی جسے اہل یونان جملہ محاسن اخلاق کا مصدر سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں نوجوانوں کی مناسب تربیت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے سے عشق کریں کہ اس کے بغیر انسان کردار و شخصیت کی بلندیوں تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔(۲۷)

مرد کی مرد سے محبت اور عورت کی عورت سے محبت ہم جنسیت کہلاتا ہے جس کی ابتداء مصر سے ہوئی۔ علی عباس جلالپوری اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ہم جنسیت یعنی مرد کی مرد سے اور عورت کی عورت سے جنسی محبت کا کھوج قدیم اقوام میں بھی ملتا ہے۔ البتہ اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف ہے بعض مورخین کی رائے میں اس کی ابتداء مصر قدیم سے ہوئی جہاں دیوی ماتا آئسس کے معبد میں ہیجڑے پجاری رہتے تھے۔(۲۸)

انسانی جذبات میں سب سے زیادہ طوفانی جذبہ ''جنسی جذبہ'' ہے۔ اسی جذبے سے تشدد کی جبلت اٹھتی ہے۔ چنانچہ سب سے زیادہ اس جذبے کی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی اور یہیں سے شادی بیاہ کے باضابطہ قوانین کی ابتداء ہوئی۔ جنسی جذبے کے بارے میں رئیس امروہوی لکھتے ہیں:

> تمام دوسرے جذبوں کی نشوونما کی طرح جنسی جذبہ بھی دانہ گندم کی طرح اگتا، بڑھتا پھولتا، پھلتا اور انجام کار مکمل درخت بنتا ہے۔ ہر بچے کی جبلت میں یہ جذبہ اس طرح مخفی ہوتا ہے جس طرح تخم میں درخت بننے کی استعداد و صلاحیت پائی جاتی ہے۔(۲۹)

جنسی محبت اور جنسی ہوس و جنس زدگی میں تھوڑا بہت فرق ہے۔ وہ یہ کہ جنسی محبت مستقبل یا طویل عرصے تک ایک فرد سے ہوتی ہے اور مطلوبہ فرد کے علاوہ کسی دوسرے سے سیکس کرنے کو جی نہیں چاہتا جبکہ جنسی ہوس ہر ایک سے اور ہر وقت سیکس کرنے کا نام ہے۔ اس کے علاوہ جنس زدگی ایک اجتماعی رجحان ہے جبکہ جنسی ہوس کا تعلق فرد کی ذات سے ہے۔

محبت ایک جنسی جذبہ ہے جسے عشق بھی کہتے ہیں۔ یہ دو افراد کے درمیان کارفرما ہوتا ہے۔ اس کی نوعیت بنے بنائے تعلقات مثلاً بہن، بھائی، ماں، باپ وغیرہ سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ چونکہ ان تعلقات سے ہٹ کر ہوتا ہے اس لیے دو مختلف افراد مل کر اس جذبے کی نشوونما کرتے ہیں۔ جذبہ جب ان کے شعور کا حصہ بنتا ہے تو وہ اپنے اس تخلیقی تعلق کو کسی طور چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس کے راستے میں جتنی بھی رکاوٹیں آتی ہیں وہ ان سے ہمت اور حوصلے کے ساتھ نبرد آزما ہوتے ہیں۔

محبت جس کی بنیاد جنس پر ہوتی ہے وہ جنسی کشش کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے لیے برادرانہ جذبات بھی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ ایک دوسرے کے دکھوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ دونوں اپنے مسائل کو حل کرتے ہوئے دراصل سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بھی ہو رہے ہوتے ہیں۔

ایرک فرام محبت میں برادرانہ عنصر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> جنسی محبت میں ایک اور تحریک بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ دوسرے فرد کے ساتھ ایک ہونے، اس سے ملاپ کی تحریک ہے۔۔۔۔۔ اگر جنسی محبت میں برادرانہ محبت کا عنصر شامل نہ ہو اور اس کا محرک محض وصل کی خواہش ہو تو پھر وہ محبت سے محروم جنسی خواہش بلکہ ہوس ہوگی یا پھر وہ محبت کی مسخ شدہ صورت ہوگی۔(۳۰)

جنسی محبت صرف اسی صورت میں باہمی احترام اور اشتراک پر مبنی ہو سکے گی جب سماج ان کے اس تعلق کی پذیرائی کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو محبت کرنے والوں کو ایسے سماج کی تشکیل میں کردار ادا کرنا پڑے گا جو ان کی محبت کے نشوونما پانے میں معاون ثابت ہو۔

یوں تو جنس کا موضوع آغاز ہی سے ادب وفن میں رچا بسا ہے جہاں کہیں اور جس زمانے میں بھی انسان نے فنی اظہار کا راستہ احتیار کیا، کسی نہ کسی صورت میں جنس کا عنصر ایسے اظہار میں شامل رہا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی ساری زندگی میں جنس ایک مسلسل فیکٹر کے طور پر شامل رہتی ہے تخلیق کائنات کے بنیادی اصول کا تعلق جنس سے ہے۔جنس کے حوالے سے نذیر احمد لکھتے ہیں:

> بیسویں صدی کے نصف اول میں جنس کے موضوع پر جتنی تحقیق وتفتیش ہوئی وہ غیر معمولی ہے اور اس سے جنس سے وابستہ کئی راز کھل کر سامنے آگئے۔وہ باتیں جو پہلے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور اسی قبیلے کے دوسرے لوگوں کے تخیلات کی محتاج تھیں، اب روزمرہ کی گفتگو کا موضوع ٹھہریں۔پردے ہٹ گئے اور جنس کا موضوع قابل قبول تسلیم کرلیا گیا۔بیسویں صدی میں سامنے آنے والی بہت سی حیرت ناک ایجادوں اور دریافتوں میں وہ علمی دریافتیں شامل ہیں جو مطالعہ جنس سے متعلق ہیں۔یہ سب دریافتیں مغرب میں ہوئیں اور پھر وہ وہاں سے اٹھنے والے علمی طوفان نے تعصبات اور ممنوعات میں پھنسے ہوئے مشرقی معاشروں میں ہل چل پیدا کردی۔(۳۱)

اس علمی طوفان کو پیدا کرنے والے مغربی مفکرین میں سگمنڈ فرائیڈ (اسٹریا) کو سب سے زیادہ اہم سائنس دان اور جدید نفسیات کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔جس دور میں فرائیڈ نشوونما کے مراحل سے گزر رہے تھے سائنسی دنیا میں تصور ذہن کو ان جانی اور پراسرار شے کا درجہ حاصل تھا۔فرائیڈ ے نے ذہن کی سائنسی تشریح کی اور بتایا کہ ذہن شعور ولاشعور پر مبنی ہے اور اس سے مراد تخیل، قوت ارادی اور جذباتی کیفیات ہیں۔جنس کو ان سب میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔فرائیڈ کے خیال میں انسانی جذبات اور ارادوں پر لاشعور کا اثر شعور سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔اس کے نزدیک خواب لاشعور کا ایک بہت اہم مظہر ہیں۔فرائیڈ کے بقول نذیر احمد لکھتے ہیں:

> جنسی محبت بلا شبہ زندگی کی نہایت ہی قابل قدر چیزوں میں سے ہے۔یہ جذبہ محبت سے لطف اندوزی کے دوران میں جسمانی اور ذہنی تسکین کا اتحاد اس تجربے کے بلند ترین درجات کی نمائندگی کرتا ہے۔(۳۲)

سگمنڈ فرائیڈ کے بعد الفرڈ ایڈلر، الفرڈ چارلس، سائمن دی بووار نے جنس کے متعلق اپنے اپنے نظریات بیان کیے۔ان ماہرین نفسیات نے عہد جدید کی فکری روشوں اور ادبی روایت پر گہرا اثر ڈالا ہے ظاہر ہے یہ اثر پہلے مغرب میں اور وہاں سے چل کر مشرق میں آیا ہے مگر ادب وفن کی دنیا میں اس کے خدوخال تلاش کرنا اسان نہیں۔اس کا سبب یہ ہے کہ فنکاروں کا جنس والاشعور اور عورت سے سروکار بڑا پرانا ہے اور اسے محض جدید نفسیات کی دین قرار نہیں دیا جاسکتا۔یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ نفسیات کی وجہ سے انسانی جذباتی کیفیات اور تخیل سے وابستہ جو خیالات

عام ہوئے فن وادب نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔

اردو ادب میں جن لکھنے والوں کے زیر اثر مغربی اثرات یہاں آئے ان میں مجموعہ انگارے کے مصنفین کا ذکر اہم ہے۔ خاص کر احمد علی کا جوان میں غالباً سب سے پڑھے لکھے اور ذہین تھے اور جن کے افسانوں میں اس زمانے کے جدید ترین مغربی رجحانات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یقیناً انہوں نے ادب کے علاوہ جدید نفسیات کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ اور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء کے درمیانی عرصے میں روسی اور فرانسیسی فکشن نگاروں کے شاہپاروں کے اردو تراجم نے ایک فضا پیدا کر دی تھی جو نہایت پر اثر تھی۔ منٹو نے طبع زاد افسانے لکھنے سے پہلے روسی اور فرانسیسی حقیقت نگاروں کے افسانوں کا ترجمہ کیا، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ منٹو نے جدید نفسیات کا مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پر ان خیالات کا اثر بہر حال پڑا۔ ''بو'' جیسے افسانے میں منٹو نے جنسی فعل کا جو نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس میں جدید نفسیاتی خیالات کی تفہیم اور فنی تکمیل کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ اسی طرح عصمت چغتائی کا ''لحاف'' اور اسی نوع کے دوسرے افسانوں اور ان کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کے پیچھے جدید نفسیات کا بالخصوص فرائیڈ کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اشفاق احمد کے ہم عصر افسانہ نگار ممتاز مفتی نے جنس اور نفسیات کو خصوصی طور پر موضوع بنایا۔ انہوں نے جنسی اور نفسیاتی تجربہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور اس طرح بنایا کہ ایک بدنام چیز ایک وقیع علمی چیز بن گئی۔

جنس سے محبت کے حوالے سے اشفاق احمد نے دوسرے افسانہ نگاروں کی نسبت ایک الگ راستہ اختیار کیا ہوا ہے۔ چونکہ اشفاق احمد کے ہاں محبت ماورائی نہیں بلکہ روحانی ہے اور جسمانی قرب سے جلا پاتی ہے لیکن یہ جسمانی تعلق کبھی بھی لچرپن کی حدود سے تجاوز کرتا نظر نہیں آتا۔ جنس اشفاق احمد کے ہاں شجر ممنوعہ نہیں ہے اور نہ ہی شرمانے کی بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وسیلہ لذت اور سطحی جذبائیت اور سفلی جذبات پیدا کرنے کا الہ بھی نہیں ہے ان کے ہاں محبت کی کلی کھلنے سے لے کر پھول بننے تک کے تمام مراحل کا ذکر ہے لیکن بہت ہی سنبھلے ہوئے اور جہاں ضروری ہو ارمزیہ انداز میں۔

افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں سیما اور زمان ایک کالج میں پڑھتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ''بندرابن کی کنج گلی میں'' کا نمدار اور کلثوم ہم جماعت ہیں اور محبت کا احساس دھیرے دھیرے جسمانی قرب سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اشفاق احمد ایک جگہ لکھتے ہیں:

> اس نے میری بات مان لی اور ہم آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ راستے میں اس نے ایک دو مرتبہ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ وہی چمک جو صدیوں زمین کا پسینہ چاٹ چاٹ کر کوئلے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ اس نے

مجھے دیکھ کر کہا ''مجھ سے رہا نہیں جاتا''

''کیا؟'' میں نے پوچھا''

''آپ برا مان جائیں گے'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا ''اگر برا ماننے کی بات ہوئی تو البتہ مان جاوں گا۔''

''میں نہیں کہتی'' اس نے سر ہلا کر کہا۔(۳۳)

اسی طرح شفاق احمد کا افسانہ ''تنکہ'' محبت کی کہانی ہے جس میں ''سرور'' روزانہ ''عطیہ'' کو پڑھانے جاتا ہے اور یہ ملاقاتیں محبت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ سرور اور عطیہ کی ایک دوسرے سے محبت کا اندازہ اس مکالمے سے صاف ظاہر ہوتا ہے:

عطیہ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا'' پتہ نہیں۔۔۔۔۔میری قسمت میں تم سے پڑھنا لکھا تھا ۔۔۔تمہاری قسمت میں مجھے پڑھانا لکھا تھا۔ سرور نے عطیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ۔''میرا ساتھ تو نہ چھوڑوں گی؟ مجھے بھلا تو نہ دوگی؟''

عطیہ نے انگلی کے گرد لپیٹے ہوئے دوپٹے کو دیکھتے ہوئے کہا۔'' پتہ نہیں میں تمہارا ساتھ کیسے دوں گی؟ کیسے دے سکوں گی لیکن یاد تو میرے اپنے بس کی بات ہے۔تم کیسے بھلائے جا سکتے ہو ۔۔تمہیں کون بھول سکتا ہے۔۔میں تو۔۔۔میں تو۔۔۔تمہیں تو کوئی بھی۔'' اس کے آنسو بھر آئے اور وہ بول نہ سکی۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ذہنوں میں بیک وقت ایک ہی بات گھوم رہی تھی ۔(۳۴)

ان مذکورہ افسانوں میں دونوں کرداروں میں محبت خیالوں خوابوں میں قائم نہیں ہوتی بلکہ ایک دوسرے کا جسمانی قرب ہی محبت کو جنم دیتا ہے۔

اشفاق احمد نے جنس سے محبت کو افسانہ ''بندرابن کی کنج گلی میں'' میں بہت ہی سنبھلے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ افسانہ کلثوم اور نمداری کی محبت پر مبنی ہے۔ ایک جگہ نمدار کی زبانی سنیے:

اس کی آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی تھی اور اس کے بال برسات کی اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو بے پروائی سے میز پر ڈالے پڑھ رہی تھی۔ انگلیاں بہت زیادہ لمبی نہ تھیں ۔جلد بہت زیادہ سفید نہ تھی۔ مگر میز پر رکھے ہوئے وہ ہاتھ حضرت مسیح کی غبا کی دو موٹی موٹی سلوٹیں معلوم ہوتے تھے۔ کلثوم اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اچھی لگتی تھی مگر اب کی وہ صرف اچھی

ہی نہ لگی تھی، بلکہ اپنے سے برتر بھی۔ میرا جی چاہا کہ ابن مریم کے دامن کو ایک بوسہ دے کر آنکھوں سے لگالوں، مگر کلاس روم میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی مجھے جرات نہ ہوئی۔ (۳۵)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں فحاشی اور عریانی کا ذکر تک نہیں کیا۔ کیونکہ فحاشی اور عریانی سماج میں بد اخلاقی و بے راہ روئی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں جنس کے موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ عریانی اور فحاشی سے پاک ہے۔ اشفاق احمد کے جنس سے محبت کو غلام حسین اظہر نے اپنے مضمون ''اردو افسانہ پاکستان میں'' میں یوں لکھا ہے:

اس نے محبت میں جسمانی تقاضوں کو اہمیت دی لیکن وہ انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کی محبت افلاطونی محبت نہیں۔ وہ جسمانی قربت کی پیداوار ہے اور جسمانی لمس سے پروان چڑھتی ہے اور جلا پاتی ہے۔۔۔۔۔۔ لیکن محبت کا پیمانہ لبالب بھر جانے کے باوجود چھلکتا نہیں۔ (۳۶)

اشفاق احمد جنس سے محبت کے قائل ہیں لیکن جنس زدگی اور جنس ہوس کے سخت خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے ''بندر لوگ'' میں دراصل بندروں کی نہیں بلکہ انسانوں کی خصلتوں کو بے نقاب کیا ہیں۔ انہوں نے جنسی حوالے سے نر بندر اور مادہ بندر کی نفسیات کو بیان کیا ہیں۔ ان کے اختلاط کے مختلف شیڈز، جن کو پڑھ کر یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ بندر یا کے متعلق لکھا گیا ہے یا یہ مناظر ہمارے اردگرد کے ہیں اور ہم بندروں کے کسی گروہ کے رکن ہیں یا انسان ہیں۔ بندر یا کی جنسی رعنائیاں ان کا استعمال اور نتائج پر بحث کرتے ہوئے اشفاق احمد لکھتے ہیں:

میرے علاقے کے اس گروہ کی بندریاں اپنی جنسی رعنائی کو نر بندروں کی جنسی آسودگی کے لیے بھی استعمال میں لاتی تھیں اور اپنی ترغیب جنسی یا سیکس اپیل سے دوسرے کام بھی نکلواتی تھیں۔ بہار پر آئی ہوئی ایک بندریا نر بندروں میں بڑی مقبول ہوتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ اٹھکھیلیاں بھی کرتی تھی۔ جفتی بھی کرتی تھی اور ان سے اپنے بدن کی ''جوئیں'' بھی نکلواتی تھی۔ ان دنوں اس کا سوشل سٹیٹس بہت بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر دوسری بندریا کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اس کے دو ہنٹر مارتی، پر چینڈوں سے ان کی تھوتھنیاں نوچتی اور گروہ کے لدھے بندر یعنی لیڈر کے ساتھ ہم صحبتی کرتی تو پھر جوان اور لونڈے قسم کے نر بندروں کو سزا بھی دلواتی۔ (۳۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشفاق احمد کتنے باریک بین ہیں کہ وہ بحیثیت انسان بے حد گہرائی سے اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیتے ہیں اور اخلاق سے گرے ہوئے خصائل کا شمار کسی گروہ میں کرتے ہیں گویا جب انسان میں یہ خصائل موجود ہوں تو وہ جانوروں کی صف میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دراصل اشفاق احمد جنسی ہوس کے خلاف ہیں اور یہ ان کے افسانے سے ظاہر ہے۔

جذبات سے محبت بھی محبت کا ایک پہلو ہے۔محبت خود ایک جذبہ ہے۔ جسے افلاطونی محبت بھی کہتے ہیں ۔اشفاق احمد کا مجموعی فکری رویہ جذبہءمحبت کے گرد گھومتا ہے۔''ایک محبت سوافسانے'' سے لے کر''طلسم ہوش افزا'' تک اسی کی نیرنگی دکھائی دیتی ہے۔

محبت کے موضوع پر اشفاق احمد کا بھرپور اور خوبصورت افسانہ''توتا کہانی'' ہے جو کہ رومانوی جذبات کی غمازی کرتا ہے۔اس افسانے میں اشفاق احمد یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کہ کسی بھی صورت میں دبایا یا ترک نہیں کیا جاسکتا۔معاشرہ،وقت،انسان،ہر دور میں اس کے راستے میں حائل رہتے ہیں اور انسان وقتی طور پر ان سے ڈرتا رہتا ہے اور اپنے دل میں خوف کا ایک طوطا پال لیتا ہے جو اس کے اندر حالات کا خوف پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھتا ہے لیکن ایک دن ایسا بھی آتا ہے جب انسان اپنے اس خود ساختہ پالے ہوئے طوطے کو قابو کر لیتا ہے اور اپنے گرد بنائی گئی خود ساختہ دیوار گرا کر محبت کی منزل کی طرف سفر کرتا ہے اور اس سفر میں وہ کسی سے نہیں ڈرتا اور اسی طرح افسانہ''توتا کہانی'' میں دیکھیے کہ آخر میں'خجستہ'' محبت کے معاملے میں اپنی جان کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی:

> اس پر وہ مسکرانے لگی اور اس کے گالوں میں دو ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔رنگے ہوئے ناخنوں والا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولی''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی اسی قدر بے قرار ہو۔میں نے سوچا دیواریں کھرچتے کھرچتے تمہاری انگلیوں میں ناسور ہو جائیں گے اور تم اجگر کی طرح کینچلی چڑھا کر میٹھی نیند سو جاؤ گے،لیکن ایسا نہیں ہوا۔تم دھن کے پکے نکلے۔۔۔آؤ اب ہم دونوں مل کر اس طوطے کی گردن مروڑیں''میں نے کہا''تو اس تو تے کو نہ مارنا۔اس میں میری جان ہے۔اگر میری جان نکل گئی تو تم مر جاؤ گی''اس نے کہا''مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔(۳۸)

دراصل اس افسانے میں اشفاق احمد نے محبت کا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ یہ کہ محبت ایک سفر ہے۔ایک کہانی ہے جو کہ آگے کی سمت بڑھ رہی ہے صرف کردار بدل رہے ہیں لیکن مادہ پرست اور ہوس پرست ذہن اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے ہاں جذبوں سے زیادہ چیزوں کی قدر ہوتی ہے اور یوں جو دلوں کا بیوپار کرتے ہیں وہ کبھی محبت نہیں کر سکتے اس لیے تو''حامد''''خجستہ'' کے پھوپھی زاد کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہے''وہ ایک تاجر ہے اور تاجر ایسی چیزیں نہیں پالا کرتے جن سے اچھا خاصا منافع نہ ہو۔''(۳۹)

اشفاق احمد نے جذبات سے محبت کے حوالے سے ایک خوبصورت افسانہ''چاند کا سفر'' لکھا ہے جس میں انہوں نے اپنے وطن سے محبت کے جذبات کا بھرپور ذکر کیا ہے۔وطن سے محبت ایک ایسا فطری جذبہ ہے جو ہر انسان بلکہ ہر ذی روح میں پایا جاتا ہے جس زمین پر انسان پیدا ہوتا ہے اپنی زندگی کے شب و روز گزارتا ہے

، جہاں اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں، جہاں اس کے دوستوں، والدین، دادا، دادی کا پیار پایا جاتا ہے۔ وہ زمین اس کا اپنا گھر کہلاتی ہے، وہاں کی گلی، وہاں کے درودیوار، وہاں کے پہاڑ عرض یہ کہ وہاں کی ایک ایک چیز سے اس کی یادیں جڑی ہوتی ہیں۔ اسی جذبے کو اشفاق احمد نے افسانہ ''چاند کا سفر'' میں پیش کیا ہے۔ یہ ان کی اپنی درس گاہ سے محبت کی کہانی ہے جو اپنی درس گاہ کو درگاہ خیال کرتا ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ چونکہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے۔ اس لیے دونوں کو اپنی درس گاہ سے محبت کا اندازہ صرف اسی ایک جملے سے بھی لگایا جا سکتا ہے ''دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درسگاہ نہیں مانتے۔۔۔ اس میں ''سین'' کے حرف کو وافر سمجھتے ہیں'' (۴۰)

اشفاق احمد کے محبت کے جذبات اور نظریات کا ایک الگ رنگ ہے۔ اپنی محبت کے جذبات ہر جگہ انوکھے انداز میں پیش کرنے کا ماہر ہے۔ کبھی کبھی وہ ان جذبات کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ قاری کے آنکھوں میں بے اختیار آنسو آنے لگتے ہیں۔ مثلاً جب گورنمنٹ کالج کا چوکیدار ان دونوں کو نکالے جانے کا اشارہ کرتا ہے تو ان کے دلوں پر کیا گزرا ہوگا؟ اشفاق احمد نے ان کے دلوں کا نقشہ ان الفاظ میں خوب کھینچا ہے:

> ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستگی سے چلنے لگی ۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے ۔ ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے، کئی بے ہودہ، نکمے، بدہیت اور بیکار لوگ درگاہوں سے اٹھا دیے جاتے ہیں۔ (۴۱)

اشفاق احمد اپنی درسگاہ کو درگاہ کہہ کر پکارنا مناسب سمجھتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر محبت کا جو جذبہ ان کے اندر مخفی ہے وہ یہ کہ اپنی درس گاہ کو چاند سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس لیے گورنمنٹ کالج کی سیر کو انہوں نے ''چاند کا سفر'' قرار دیا ہے کہ اصل میں ہم چاند کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کو گورنمنٹ کالج سے اٹھائے جانے کے بعد واپسی کے منظر کو اشفاق صاحب نے کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری کے سامنے وہ منظر تیرنے لگتا ہے۔ انہوں نے اپنی دلی کیفیت اور جذبے کو انتہائی خوبصورت مثال دے کر پیش کیا:

> اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی اسی کی طرف کا سفر ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب Space shuttle زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا، پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی

منزل چاند ہی ہوتی ہے۔(۴۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اشفاق احمد کا شمار اردو کے ذہین ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ کہانیوں کی زبان میں سوچتے اور زندگی کو افسانہ کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور اس صورت واقعہ کو مختلف کرداروں کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پوری زندگی آپ کے سامنے اپنا اسرار بنات النفس گردوں کی طرح عریاں کر ڈالے ہیں۔

اشفاق احمد کے اکثر افسانے محبت کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ایک افسانے میں بیک وقت جذبے سے محبت، مقصد سے محبت، عورت سے محبت اور چھوٹے بچوں سے محبت نظر آتی ہیں۔محبت کے دوسرے عناصر کی طرح اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں مقصد سے محبت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔مقصد سے محبت کسی خاص نظریے سے محبت اور جذبے سے لگاؤ کا دوسرا نام ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''شب خون'' جس کا مرکزی کردار ''شقو'' ہے اس کردار کو اشفاق احمد نے نہایت خوبصورتی اور مہارت سے تراشا ہے اور اس کا مکمل ذہنی ونفسیاتی تجزیہ کر کے دکھایا ہے۔''شقو'' مرض الموت ٹی بی میں مبتلا ہے۔موت کے دھانے پر کھڑا ہے۔ایسی حالت میں ایک طرف تو وہ موت اور حالات سے سمجھوتہ کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن دوسری طرف صحت مند رہنے کی آرزو نے بھی اسے شدید کشمکش سے دوچار رکھا ہے۔

دانتے کی عملی زندگی میں ''بیٹرس'' ایک جیتی جاگتی تصویر تھی جس کی عالم شباب میں وفات کے بعد دانتے نے اپنی شہرہ آفاق، تمثیلی نظم ڈوائن کامیڈی لکھی جس میں بیٹرس سے اپنی محبت کا بھرپور اظہار کیا ہے اور بیٹرس کا کردار ایمان اور پاکبازی کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔غالباً اشفاق احمد نے بھی افسانہ ''شب خون'' میں بیٹرس کا کردار دانتے کی ''ڈوائن کامیڈی'' سے مستعار لیا ہو لیکن اشفاق احمد کا یہ کردار محبت اور ہمدردی کا نمونہ ہے۔

افسانہ ''شب خون'' میں ایک نرس ''بیٹرس'' کا کردار ہے جو کہ ''شقو'' سے محبت کرتی ہے لیکن شقو کے دل میں ان کے خلاف عناد پیدا ہوا۔شقو بذات خود اپنی زندگی سے مکمل مایوس ہو چکا ہے اور اسی ناامیدی نے اس کے دل میں صحت مند لوگوں کے خلاف ایک ردعمل کو جنم دیا ہے۔بیٹرس کا صحت مند ہونا اس کے لیے مصیبت بن گیا ہے:

> آخر بیٹرس کو کیا حق ہے کہ سرخ وسفید چہرہ ہمارے درمیان گھرمتی پھرے، خدا نے اسے کیوں صحت مند بنایا اور ہمیں بیمار! وہ اپنی جوانی، صحت اور تنومندی کی نمائش کر کے ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔اس کے لاشعور میں ہماری کمزوریوں اور بیماریوں کے خلاف تمسخر ہے۔آخر کیوں اسے اتنا خون سونپا گیا ہے، کیوں ایسی زندگی عطا کی گئی ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟(۴۳)

اس کہانی میں اشفاق احمد کا مقصد یہی ہے کہ بعض لوگ معاشرے میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو محبت کا جواب

محبت کی بجائے نفرت سے دیتی ہیں۔جیسا کہ اس افسانے سے صاف ظاہر ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے کسی بیماری میں مبتلا کر دیا انہیں چاہیے کہ وہ صبر سے کام لیں کیونکہ یہی بیماری ان کے لیے آخرت میں نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے۔اس افسانے کا یہ مقصد بھی ہے کہ بیماروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا چاہیے جس طرح بیٹرس نے یہ رول ادا کیا۔

ادیب کسی بھی معاشرے کا سب سے حساس طبقہ ہوتا ہے لہذا ادیب کے ذمہ ایک حد تک معاشرے کی تربیت بھی ہے۔اشفاق احمد ادیب ہونے کے باوجود ''ادبا برادری'' کا محاسبہ کرتے نظر آتے ہیں کیونکہ مقصد ہی سماج کی اصلاح ہے تو پھر کسی بھی شعبے کو نہیں چھوڑ سکتا۔

اشفاق احمد نے ادیبوں پر طنز کرتے ہوئے ''بٹیر باز'' ایک طنزیہ افسانہ تحریر کیا ہے۔غلام قوم کے ادیب جس طرح مغربی نظریات و افکار کے لنڈا بازار کی اترن پہن کر فخر محسوس کرتے ہیں اور چند من گھڑت نظریات کو پیش پا افتادہ محاورہ میں ادا کر کے دانشور بن بیٹھے ہیں۔ان پر اشفاق احمد اپنے تلخ احتجاج کا ظہار کرتے ہیں۔اشفاق احمد نے اس افسانے میں یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ادب صرف نظریہ سازی اور فقرہ بازی بن کر رہ گیا ہے اور ہر فرد لکے کبوتر کی طرح گردن اکڑائے پھرتا ہے۔چاہے اس کی گروہ میں کوئی صلاحیت ہو یا نہ ہو،ذہن میں علم کا خزینہ ہو یا نہ ہو،بس خود کو نمایاں کرنا ہی سب کچھ ہے جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے:

> لطیف نے اندر جا کر لڑکے سے پوچھا'' آپ کے پاس کچھ نظریات ہوں گے'' ''کیوں نہیں'' ان دونوں الماریوں میں نظریات ہی نظریات ہیں لیکن آپ کو اصل میں کسی چیز کی ضرورت ہے ؟لطیف سوچ میں پڑ گیا تو اس عورت نے ایک منجھے ہوئے سیلز مین کی طرح کہا:'' آپ کو افکار چاہیں،خیال چاہیں یا صرف نظریات کی ضرورت ہے۔؟''
>
> لطیف نے کہا'' سچی بات یہ ہے میڈم کہ میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں اور اس فیلڈ میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔آپ جس طرح سے مجھے گائیڈ کریں گی میں قبول کر لوں گا۔(۴۴)

اس افسانے میں اشفاق احمد نے بتایا ہے کہ ہمارے ادیب مغرب کے متروک نظریات چرا کر جس طرح دانشوروں کے منصب پر فائز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ غلامانہ ذہنیت کی عکاسی ہے۔اشفاق احمد نے ایسے ادیبوں پر دل کھول کر طنز کے تیرے برسائے ہیں۔

اشفاق احمد کے بارے میں اکثر نقادوں کا کہنا ہے کہ ان کے اکثر کردار محبت کے حوالے سے جدائی کے المیے سے دو چار نظر آتے ہیں۔ان کے کرداروں کا مقدر صرف اور صرف جدائی ہے۔اشفاق احمد کو اپنے انہی کرداروں سے محبت ہے جو کہ جدائی کے المیے کا شکار ہیں۔مثال کے طور پر افسانہ ''شب خون'' میں ''بیٹرس'' ''جو

''شقو'' کو دل سے چاہتی ہے۔ ''شقو'' کی موت کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جاتی ہے اور شقو شکست خوردہ سپاہی کی طرح بیٹرس کے ہونٹوں پر اپنی جان دے کر اس دنیا سے کوچ کر جاتا ہے۔

اشفاق احمد کے مقصد سے محبت کے حوالے سے جو نظریہ ہے وہ یہ کہ انہوں نے اکثر افسانوں میں کسی خاص مقصد کو مرکز مان کر اس کے گرد افسانے کو بنا ہے تا کہ وہی مقصد قاری کے دل و دماغ میں جگہ پا کر خود کو اور معاشرے کو فائدہ پہنچا سکے۔ ان افسانوں میں سماجی مقاصد، معاشی مقاصد، سیاسی مقاصد اور اخلاقی مقاصد کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اشفاق احمد نے اردگرد کے ماحول سے متعلق کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ہر ایک پہلو کو اپنے افسانوں کے اندر سمویا ہے۔ افسانہ ''اجلے پھول'' ''گڈریا'' ''محسن محلّہ'' ''چاند کا سفر'' ''بندر لوگ'' اور افسانہ ''بٹیر باز'' مقصد سے محبت کے حوالے سے بہترین افسانے ہیں۔

عورت اور مرد کی محبت فطری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کے دل میں مرد کے لیے اور مرد کے دل میں عورت کے لیے جگہ بنائی ہیں اور اسی محبت کی وجہ سے مرد اور عورت زندگی کے ایام گزارتے ہیں۔ عورت اور مرد کی فطری محبت بھی مختلف حالات اور کیفیات کی وجہ سے مختلف رہی ہیں۔ کبھی مرد کا جذبہ محبت شدید تر ہوتا ہے تو کبھی عورت کا۔ بہر حال یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کی آپس میں فطری محبت ہوتی ہے۔

اردو فکشن میں عورت اور مرد کی محبت کے حوالے سے ان گنت افسانے ملتے ہیں جن میں مرد کی عورت سے اور عورت کی مرد سے عشق و محبت اور پیار کی متنوع صورتیں شامل ہیں۔ ہر ایک افسانہ نگار نے اپنے اپنے تجربات کو پیش کیا ہے اور اپنے سماج کی عکاسی کی ہے۔ عورت کے جذبہء محبت کے حوالے سے ول ڈیورینٹ نے اپنی کتاب نشاط فلسفہ میں ایک جگہ لکھا ہے:

> عورت کا جذبہء محبت مرد کے مقابلے میں کم شدید ہوتا ہے لیکن اس میں وسعت اور گہرائی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اس کی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر کونہ میں سرایت کر جاتا ہے۔ وہ جبھی زندہ رہتی ہے اگر اس سے محبت کی جائے۔ فرانس کے ایک مجسٹریٹ نے جب ایک عورت کو ایک چور کے ساتھ تعلقات قائم کرنے پر مطعون کیا تو اس نے جواب دیا کہ ''جب میں مبتلا نہیں ہوتی تو میں زندگی سے محروم ہو جاتی ہوں۔ (۴۵)

عورت فطری طور پر اپنے آپ کو خوش رکھنے سے قاصر ہے اسلیے اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کے دل بہلانے کا ذریعہ بنایا کیونکہ مرد کی زندگی میں محبت کا ایک جزو ہے۔ عورت اور مرد کی اسی محبت کے ضمن میں ول ڈیورینٹ لکھتے ہیں:

عورت کے لیے اپنے آپ کو خوش رکھنا بہت مشکل ہے۔انہیں ایک دوسرے کی موجودگی میں بے حد الجھن محسوس ہوتی ہے اور اس بیزاری کو مردوں کی باتوں سے بہلاتی ہیں اور یہ بات قدرت کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔جیسا کہ مدت ہوئی روشفو کو نے کہا تھا کہ آکثر عورتیں اس لیے دوستی کی اہل نہیں ہوتیں کہ دوستی محبت کے بعد پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے اور بقول شاعر، محبت مرد کی زندگی کا ایک حصہ ہے مگر عورت کا سارا وجود۔ہمیں اپنی فطرتوں کے مطابق زندہ رہنا ہے (۴۶)۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں عورت اور مرد کی فطری محبت کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔افسانہ ''تو تا کہانی'' مرد اور عورت کی فطری محبت کا آئینہ دار ہے۔جس میں ''حامد'' اور ''خجستہ'' مرکزی کردار ہیں۔حامد ایک چالاک اور شوخ نوجوان ہے جسے اپنے پڑوس کی لڑکی سے محبت ہوگئی ہے لیکن حامد جانتا ہے کہ ''خجستہ'' بھی اس سے محبت کرتی ہے۔خجستہ دوسرے لڑکیوں کی طرح اس میدان میں انتہائی بزدل ہے۔حامد، خجستہ کے دل سے خوف کا یہ طوطا نکالنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے ''خجستہ'' ان سے ملنے سے کتراتی ہے۔حامد کی باتیں اور مکالمے اس کی فکر اور قابلیت کی بہترین دلیل ہیں۔وہ جس طریقے سے ''خجستہ'' کی تمام غلط فہمیوں کو دور کر کے اپنی محبت کا یقین دلاتا ہے، قاری اس کی ذہانت اور محبت کا قائل ہو جاتا ہے:

اس نے آنسو پونچھ کر کہا ''میری پھوپھی بھی ساتھ ہیں اور میں ان کے لڑکے سے منسوب ہو چکی ہوں۔تم کیوں۔۔۔۔۔میں نے کہا ''تم اس سے منسوب ہو جس کا انتظار تم نے سائنس روم کی سیڑھیوں پر کیا۔تم اسی سے بیاہی جاؤ گی جس کے لیے تم لنکا کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھری ہو۔تمہارے پھوپھی زاد بھائی کا وجود محض ایک حادثہ ہے۔موٹر پہلے زمزمہ کے چبوترے سے ٹکراتی ہے، حادثہ بعد میں اسے الٹا کر اس کے مڈگارڈ اور بتیاں توڑ دیتا ہے۔(۴۷)

افسانہ ''تو تا کہانی'' میں خجستہ کی ذہنی کیفیت اسی شعر جیسی ہے۔

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں

میرے چہرے سے تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی

عورت کے دل کے اندر مرد کے لیے ایک فطری محبت اور کشش موجود ہے۔ہر لڑکی کے ذہن میں محبت کا جذبہ ضرور ہوتا ہے لیکن مرد کے مقابلے میں عورت ذات کے لیے محبت کا اظہار کرنا کافی مشکل ہے۔''خجستہ'' حامد سے محبت کرنے کے باوجود ایک بے بس لڑکی دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنے گھر کی چھت پر مختلف قسم کے بہانوں کے ذریعے اپنی محبت ''حامد'' پر ظاہر کرتی ہے لیکن برملا طور پر اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔اسی کہانی میں حامد بھی خجستہ کو یہی

باور کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ شخص میں تھا جو کبھی دھیرے سے تمہیں خیالوں میں گدگدا دیتا تھا سڑھیوں پر تم میرا انتظار کیا کرتی تھی:

> میں نے اس کا کندھا تھپک کر کہا ''ہم جسے ظالم کہتے ہیں، وہ دراصل ہمارا اپنا پیار ہوتا ہے۔ ہم جسے مایوسی سمجھتے ہیں وہ ہماری ابھرتی ہوئی آس کی زمردیں کلغی ہوتی ہے اور جسے تم بدمعاش کہتی ہو، وہ تمہارا محبوب ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کسی کی محبوبہ بننے کی سعادت نصیب ہوتی تو تم یقیناً ایسا نہ کہتیں لیکن رونا تو یہی ہے کہ تم بچپن سے لے کر اب تک محبت کرتی آئی ہو اور بڑھاپے میں بھی اپنے عاشقانہ جذبات سے گریز نہ کر سکو گی۔ پتہ نہیں اب تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ (۴۸)

اشفاق احمد کے افسانہ ''زرناب گل'' میں بھی عورت اور مرد کی فطری محبت کی جھلک نمایاں نظر آتی ہیں۔ افسانہ ''زرناب گل'' ان خوابوں کی کہانی ہے جو دو محبت کرنے والوں نے بنے۔ وہ حقیقت تو نہ بن سکے لیکن آنکھوں سے فراموش بھی نہ ہو سکے کہ یہ خواب دلوں میں رچی محبت کا شاخسانہ تھے۔ راوی اپنے گاؤں کے ایک پنسال نویس کی بیٹی نجمہ سے محبت کرتا ہے وہ بھی دل و جان سے اس پر فدا ہے۔ میٹرک میں وظیفہ پانے کے بعد ''میں'' نجمہ فیروز پور کے ''مہادو دیالا کالج'' میں داخل ہو گئی اور وہاں دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک دن افسانے کا واحد متکلم ''میں'' نجمہ سے کہتا ہے:

> میں نے نجمہ کو بتایا تھا کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی ور ہمارا بیٹا پیدا ہو گا تو ہم اس کا نام زرناب گل رکھیں گے اور اس کو تیر اندازی کا فن سکھائیں گے۔ جب وہ جوان ہو گا تو ہم اس کو خٹک ناچ سکھائیں گے۔ اس کی ماں تو اپنے چہرے پر آئی ہوئی لٹ کو پھونک مار کر اوپر اٹھاتی ہے، وہ جھٹکا دے کر اپنے زلفوں کو واپس لایا کرے گا۔ (۴۹)

اشفاق احمد کے افسانوں میں حقیقت کی نسبت رومانیت کا غلبہ ہے ان کے ہاں موضوع کی وسعت نہیں ہے لیکن جو کچھ انہوں نے لکھا ہے یا زندگی کے جس پہلو کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا ہے اس میں سوچ کی گہرائی ضرور ملتی ہے۔ افسانہ خواہ کسی بھی موضوع سے تعلق رکھتا ہو اس میں سوکھا پن پیدا نہیں ہوتا اور زندگی کے بعض حقائق اس طرح رواروی میں آتے جاتے ہیں جیسے حالات کے تقاضوں سے خود بخود ابھر رہے ہوں۔

افسانہ ''اجلے پھول'' انجم اور طلو کی محبت پر مبنی کہانی ہے۔ انجم اور طلو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں، محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اپنا کر ساری زندگی سامنے رکھ کر پو جنا چاہتے ہیں لیکن اظہار میں کنجوسی برتتے ہیں ''قبول صورت'' انجم بھائی نے کہا ''ذرا اپنی صورت تو دیکھو آئینے میں۔ اگر پپوٹوں کی ایک جنبش پر کوہ قاف کی ساری مخلوق قربان نہ

ہو جائے تو سہی'' (۵۰)

انجم کو فوج میں کمیشن مل جاتا ہے۔ طلو کو ملٹری اکیڈمی سے خط لکھتے ہیں کہ ٹریننگ کے بعد ابھی لیفٹیننٹ کے عہدے پر ہے اور برما فرنٹ لائن کا جانے کا حکم انہیں ملا ہے، جس دن انہوں نے طلو کے شہر سے گزرنا تھا تو طلو اور اس کی چھوٹی بہن ملنے آ گئیں:

''مجھے اپنے ساتھ یوں لپٹا لیا جیسے میں ان سے پنسل ترشوانے ائی تھی، ہنس کر کہنے لگی ''ذرا طلو کا منہ تو دیکھو، ایسی وہمی لڑکی میں نے اپنی زندگی میں کوئی نہیں دیکھی ایسی کھڑی ہے گویا میرا جنازہ اٹھنے والا ہے۔'' (۵۱)

اس کہانی میں انجم طلو سے کہتا ہے: ''فرنٹ پر پہنچتے ہی میں ابا کو لکھوں گا۔ پھر دیکھوں گا، وہ کیسے انکار کرتے ہیں'' (۵۲)

انجم کی طلو سے محبت انتہا کو پہنچ چکی ہے اور طلو کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ میں ہمت عالی دیکھتا ہے۔ انجم طلو سے کہتا ہے:

''تمہیں حاصل کرنے کے لیے میرے جو قدم اٹھیں گے، مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔ میں ایک دن تمہیں لینے کے لیے آؤں گا۔ خواہ میری راہ میں جہنم ہی کیوں نہ حائل ہو جائے۔'' (۵۳)

عورت اور مرد کی فطری محبت کے حوالے سے اشفاق احمد کا افسانہ ''پانچ میل دور'' ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ افسانہ طبقاتی تقسیم کے ان ''پانچ میلوں'' کی کہانی ہے جو دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان حائل ہوتے ہیں۔ جو بظاہر تو پانچ میل ہوتے ہیں لیکن جن کی مسافت کبھی ختم نہیں ہوتی۔

افسانہ ''پانچ میل دور میں ''طاہر'' اور ''بانی'' کے لطیف جذبات بیان کیے گئے ہیں۔ طاہر، بانی سے محبت کرتا ہے اسے اپنا کر شریک حیات بنانا چاہتا ہے۔ بانی بھی یہی چاہتی ہے:

سونے سے پہلے جب طاہر دانت صاف کر رہا تھا تو بانی غسل خانے میں ہاتھ دھونے آئی، اس نے صابن کا پھین ہاتھوں سے لپٹتے ہوئے کہا'' آپ گھبرائیں نہیں۔ ابا جان کی باتوں پر نہ جائیں وہ ایسے ہی کرتے ہیں۔ دیکھ لینا ایک دن تم ابا جان سے بھی بڑے افسر بن جاؤ گے۔ طاہر نے برش منہ سے نکال کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بانی کی آنکھوں میں خلوص اور یقین کے اشارے اندھیاروں کے جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے رہے تھے۔ (۵۴)

عشق ناتمام کی کسک اشفاق احمد کے افسانوں میں گہری نقش گری کرتا ہے اور قاری اس درد کو پورے کرب کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ان کے افسانوں میں محبت کا انجام المناک دکھایا گیا ہے۔ان کے رومانوی کردار جدائی کے المیے کا شکار رہتے ہیں۔

اس میں محبت کرنے والوں کا قصور نہیں ہے بلکہ زمانے کی عام روش ہی ایسی ہے کہ مختلف معاشی ،معاشرتی ،سماجی ،طبقاتی اور دیگر اختلافات محبت کے راستے کی دیوار بن جاتے ہیں اور مختلف وجوہات کی وجہ سے محبت کا انجام کرب ناک ہو جاتا ہے۔

(ج) محبت کا روحانی تصور:۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں جسمانی اور روحانی محبت دونوں کے بہترین مرقعے موجود ہیں۔جس طرح انہوں نے جسمانی محبت کے جذبات کو افسانوں میں جگہ دی ہیں اس سے کہیں زیادہ روحانی محبت کے تقاضے پورے کئے ہیں۔

''گڈریا'' اشفاق احمد کا شاہکار افسانہ ہے۔مذہب،معاشرہ،دوستی،محبت اور ایثار کی معراج اس افسانے میں باکمال ہے۔حکمت کی باتیں،اقوال کی صورت ذہن و دل کو منور کرتی چلی جاتی ہیں۔قاری افسانہ پڑھتے پڑھتے ٹھہر سا جاتا ہے اور ایک ایسے سفر کی طرف گامزن ہو جاتا ہے جہاں معنی کے کئی جہان اس کے منتظر ہوتے ہیں۔یہ کہانی فسادات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے جس کا مرکزی کردار (داؤ جی) مذہبی امتیاز سے بالاتر ہو کر محض اعلیٰ انسانی اقدار پر ایمان رکھتا ہے جو خود عذاب جھیل کر انسانی بربریت اور سنگدلی کا کفارہ ادا کرتے ہوئے عیسیٰ مسیح کا استعارہ بن جاتا ہے۔

افسانہ ''گڈریا'' میں استاد شاگرد کے مابین محبت میں مذہب،ذات پات کی تخصیص کہیں دکھائی نہیں دیتی بلکہ ایثار ہی ایثار ہے۔داؤ جی جیسے استاد کے ہاں بغیر مذہب کی قید کے در فیض سب کے لیے کھلا تھا۔اسی طرح ''گولو'' بھی داؤ جی کے ایک سکھ کو مومن کہہ دینے پر چپ سا ہو جاتا ہے لیکن کہتا کچھ بھی نہیں کہ داؤ جی کو دکھ ہوگا۔

افسانہ ''گڈریا'' میں داؤ جی کا اصلی نام ''چنت رام'' ہے۔جو کہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔چنت رام ایک ہندو استاد ہے۔قیام پاکستان سے پہلے فارسی اور اردو کے بہت سے استاد غیر مسلم ہوا کرتے تھے۔افسانہ ''گڈریا'' کے بارے میں اشفاق احمد اپنی کتاب عرض مصنف میں لکھتے ہیں:

> گڈریے کا کردار ایک غیر مسلم اتالیق چنت رام کا ہے۔یہ کچھ میرے تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جیتے جاگتے رہتے سہتے انسان کی کہانی ہے جو ہماری آپ کی زندگی میں اگر اب نہیں ہے تو رہا ضرور

ہے۔ہمارے زمانے میں فارسی اردو کے بہت سے استاد غیر مسلم ہوا کرتے تھے،جنہیں اسلامی تہذیب اور مسلم ثقافت سے بڑا پیار ہوتا تھا۔ان کے سوچنے کا انداز ،بات کرنے کا طریقہ اور زیست کرنے کا قرینہ بالکل اسلامی تہذیب کا علمبردار ہوتا تھا۔(۵۵)

افسانہ ''گڈریا'' اشفاق احمد نے روم میں مقیم ہونے کے دوران لکھی ہے ۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ ''گڈریا'' اشفاق احمد سے لکھوایا گیا ہے تو بجا ہوگا کیونکہ وہ ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

میری زندگی میں خاص کوئی استاد گڈریے کی نوعیت کا نہیں آیا لیکن میں نے ایسے بہت سے استادوں کو دور سے ضرور دیکھا تھا۔ان پر لکھنے یا انہیں اپنے افسانے کا پیرہ بنانے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ سناچون میں جب میں روم میں مقیم تھا،مجھ پر اچانک یہ کہانی لکھنے کا جنون سوار ہوگیا۔اسی طویل کہانی کو مادہ پسندی اور مادہ پرستی کے منطقے میں لکھنا کافی مشکل کام تھا ۔''گڈریا'' میں نے کوئی دس گیارہ مختلف نشستوں میں لکھی ہے اور نہایت ہنگامہ پرور ماحول میں لکھی ہے۔(۵۶)

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کے مختلف کرداروں ،مکالموں مناظر اور واقعات کو کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہیں کہ قاری کو جنسی بے راہ روی،فحاشی یا عریانی کا شائبہ واحتمال تک نہیں رہتا۔اشفاق احمد روحانیت کے استاد تھے انہوں نے افسانوں میں روحانی محبت کے تقاضوں کو اسلامی تعلیمات کی رنگ میں رنگا ہیں۔

روحانی محبت کے حوالے سے اشفاق احمد کا افسانہ ''رات بیت رہی ہے'' انتہائی دلچسپ اور خوبصورت افسانہ ہے۔اس افسانے میں روحانی محبت کی مکمل تعریف اور تصویر نظر آتی ہے۔اپنی خواہشات اور مرضی کو اپنے محبوب کے سامنے تج دینا ہی اصل محبت ہے اور اپنے اختیار کی ٹوکری اپنے محبوب کے قدموں میں رکھ کر دینا محبت کا عظیم منصب ہے۔اس افسانے میں بھی ہیرو نے اپنی خواہشات اور مرضی کو اپنی محبوبہ کے سامنے مکمل طور پر ختم کر دیا ہے۔حالانکہ جب اس کا اعتبار خدا کی ذات سے اٹھ جاتا ہے اور وہ خدا کی ذات سے منکر ہوجاتا ہے تو اپنی محبوبہ کی ایک دھمکی کے بعد اسے ہر چیز میں خدا کا ظہور نظر آنا شروع ہوجاتا ہے:

جب میں نے خدا کو ماننا چھوڑ دیا تو اوروں کے ساتھ تمہیں بھی رنج ہوا۔بھائی جان سے میری لمبی لمبی بحثیں سن کر تم نے مجھ سے پوچھا تھا۔'' آخر آپ خدا کو مانتے کیوں نہیں۔؟''تو میں نے کہا تھا کہ''اس کے ماننے یا نہ ماننے سے انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''تو تم نے جواب دیا تھا کہ ''میں تو سمجھتی تھی فلسفہ سے تمہارا دماغ روشن ہوجائیگا ۔پر۔۔۔۔۔۔روشن ہی تو ہوا ہے۔''میں نے کہا تھا۔''جب وقت ۔۔۔۔۔وقت اور فاصلہ میں کچھ نہیں سمجھتی ۔''تم نے بات کاٹ کر کہا

۔''آج سے خدا کو مانا کرو۔''''لیکن۔۔۔۔۔لیکن کچھ نہیں۔میں جو کہتی ہوں کہ خدا ہے۔(۵۷)

افسانہ''گڈریا''میں''داؤ جی''روحانی محبت کا جیتا جاگتا کردار ہے۔داؤ جی کا کردار اپنے اندر اعلیٰ انسانی اقدار کو سمیٹے ہوئے ہیں۔پرخلوص دوستی،وفا،بےلوث خدمت،دوسروں کے مذہب کا بلا امتیاز احترام کرنا،بردباری، احسان مندی کا شدید جذبہ اور فقر پسندی وغیرہ وہ اپنی محدود زندگی میں ان تمام خصوصیات کو بروئے کار لاتا ہے۔داؤ جی کی ڈاکٹر صاحب سے سچی دوستی اور محبت کی نشانی یہ ہے کہ وہ ان کے بچوں کو بغیر مالی فائدہ لیے پڑھاتا رہتا ہے۔

داؤ جی کا اپنے اساتذہ سے روحانی محبت اور احترام کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ اپنے اساتذہ سے ملتے ہیں تو ان کا نام لے کر ہاتھ جوڑتے ہیں:

> داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں۔؟اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں۔؟داؤ جی نے مسکرا کر کہا۔''جو طویلے کے ایک کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام ہے۔یہ منشی جی ہیں۔وہ مسیحا نہ ہو،وہ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟(۵۸)

اشفاق احمد محبت کے دوسرے پہلوؤں کی طرح روحانی محبت کے پرستار ہیں انہوں نے اپنے افسانوں میں جگہ جگہ روحانی محبت کی پوری جھلک جھلک دکھائی ہیں یا یوں کہیے کہ اشفاق احمد روحانی محبت کے علمبردار ہیں۔

افسانہ''فہیم''میں''نانا''ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جس کو تمام کائنات سے محبت ہے اور وہ سب کو محبت کا درس دیتا ہوا نظر آتا ہے۔''نانا''ایک ایسا کردار ہے جس کے تمام رویے روحانی ہیں۔اس کو مادیت چھو کر نہیں گزری۔ذہنی سکون اور روحانی غذا کی تلاش میں پیر،فقیر کی درسگاہ پر جانے سے بھی گریز نہیں کرتا۔غرور سے ہمیشہ دور بھاگتا ہے۔بوٹ صرف اس وجہ سے نہیں پہنتا کہ اس سے غرور و تکبر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے:

> وہ اتنا عرصہ سرکاری نوکر بھی رہے،تجارت بھی کی دوسری ملازمتیں بھی کیں مگر سوائے فوج کے کبھی بوٹ نہ پہنے۔میری خواہش تھی کہ وہ بھی دوسرے بھائیوں کی طرح ٹھپ ٹھپ کرتے چلیں۔آخر کون سی کمی تھی ان میں،مگر وہ نہیں مانے۔یہی کہتے رہے،بوٹ پہن کر آدمی مغرور ہو جاتا ہے۔اس کی اونچائی اور آواز انسان کے دل میں تکبر پیدا کر دیتی ہے۔میں اور سارے کام کرنے کو تیار ہوں،پر بوٹ نہیں پہنوں گا۔(۵۹)

''نانا''کے ہاتھ جو کچھ آتا ہے خیرات کرتا ہے۔وہ دل کا امیر ہے،مخلوق خدا سے اتنی محبت ہے کہ ان کا پالتو کتا مر جاتا ہے تو اس کا صدمہ برداشت نہیں کر پاتا اور خود بھی خالق حقیقی سے جا ملتا ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں روحانی محبت کے ساتھ ساتھ جسمانی محبت کے نمونے بھی ملتے ہیں کیونکہ حقیقت میں اشفاق احمد کے فلسفہ حیات کا مرکز محبت ہے۔ داؤ جی کے علم کا سحر محبت کے اسم اعظم کے طفیل بولتا ہے ۔ یہی نہیں افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں بھی ایک ائیڈیل استاد پروفیسر دیس راج، محبت اور علم کا مجسمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، جسے ہم داؤ جی کے کردار کا ابتدائی نقش کہہ سکتے ہیں۔ محبت کے اس غیر معمولی گرم جوشی کے اظہار کو دیکھ کر ''ایلن '' اپنے شوہر وحید سے پوچھتی ہے ''تمہارے دیس میں سارے دادے اپنے پوتوں سے کیا ایسا ہی پیار کرتے ہیں ۔''(۶۰)

اشفاق احمد کا افسانہ ''امی'' میں جسمانی محبت ان کے منہ بولے جواری بیٹے کے لبوں پر آخری وقت موت سے مہلت کی اپیل بن کر ناچتی ہے۔ یہی محبت ٹی بی وارڈ میں بیڑس کو اتنی قوت اور اعتماد دیتی ہے کہ وہ نہ صرف ناک پر حفظ جان کا رومال پہن رکھتی ہے بلکہ اپنا خون بھی مریضوں کو دیتی پھرتی ہے۔ یہ محبت انسانی اور جسمانی سطح پر بھی ہے مگر اشفاق احمد کے محبت کرنے والے تمام کردار اپنے دکھ اور ملال سے پہچانے جاتے ہیں۔

افسانہ ''بابا'' میں جسمانی محبت کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ بابا کا بیٹا ''وحید'' جو کہ ایک ڈاکٹر ہے لیکن ڈاکٹری کے پیشے سے محبت نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ زمینوں میں کھیتی باڑی کرے اور زندگی کا پہیہ رواں دواں رکھے۔ وہ چاہتا ہے کہ مادہ پرست لوگوں سے دور اپنی محبت کی دنیا بسائے رکھے۔ اپنی بیوی ''ایلن'' کو حد سے زیادہ چاہتا ہے اور اس سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ ''ایلن'' کی خواہش کا پاس رکھتے ہوئے فوج کو اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ ''ایلن'' کی محبت اسے جانے نہیں دے رہی تھی لیکن ایلن کی خواہش پر اپنے مستقبل کی تعمیر نے اسے ایک ذہنی کشمکش سے دوچار کیا تھا ''جب میں وہاں سے لوٹوں گا تو ابنگڈن چلیں گے اور پھر ساری عمر وہیں رہیں گے اور اپنے بابا کو بھی لے چلیں گے لیکن اب تم فکر نہ کرو میں کونسے محاذ پر چلا ہوں جو تم اس طرح بیٹھی ہو۔''(۶۱)

اس افسانے میں ''ایلن'' ایک محبت کرنے والی وفادار بیوی کی رول ادا کرتی ہے۔ وہ اپنی محبت کے لیے اپنا وطن، اپنا قبیلہ سب کچھ چھوڑ دیتی ہے اور ''وحید'' سے شادی کر کے اس کے گاؤں میں آ کر رہنے لگتی ہے۔ ''ایلن'' کو وحید سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد صرف اور صرف وحید کی محبت ہی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی وطن، وطن کے لوگوں اور اپنے رشتہ داروں کی یاد بھی ستاتی رہتی ہے اور وحید کی روشن اور شاندار مستقبل کے لیے اسے دوبارہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرنے کی تاکید کرتی ہے۔

یہ دنیا محبت کے بل بوتے پر قائم و دائم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق سے بے حد محبت ہیں۔ اپنے پیارے بندوں سے اللہ تعالیٰ ان کی ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے محبت کا عنصر انسانوں، جانوروں، چرند ، پرند سب کو عطا کیا تا کہ یہ بھی محبت کی لذت سے آشنا اور لطف اندوز ہو سکیں۔

اردو ادب میں متعدد شعراء اور ادیبوں نے محبت کے مختلف پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہیں جن سے آنے والی نسلیں اور ادب پڑھنے والے مستفید اور محظوظ ہوں گے۔ فکشن کے حوالے سے محبت کے متنوع پہلوؤں میں سے ایک گوشہ محبت معصوم بچوں اور جانوروں سے محبت کا بھی نمایاں نظر آ رہا ہے۔

اشفاق احمد کے ہاں افسانے میں محبت کا ایک دریچہ معصوم بچوں اور پالتو جانوروں کے لیے وقف ہے۔ انہوں نے متعدد ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں بچوں کی آوازوں کو اس طرح دبایا جاتا ہے جیسے ظالم فوجی امر کے دور میں مجبور رعایا کی آہ و بکا۔ ''فہیم، تلاش، گاتو، پناہیں اور گل ٹریا'' ان افسانوں کی فہرست میں شامل ہیں جن میں معصوم بچوں اور پالتوں جانوروں سے محبت و ہمدردی نمایاں ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم افسانہ ''تلاش'' ہے جس میں ایک بچہ اپنے کتے ''جیکی'' کی تلاش میں خود گم ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد بچوں کی گفتگو، ان کے اعمال و واقعات اور جذبات کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ بچے کی ذہنی کیفیات کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے:

> امی کی طبیعت میں ایک عجیب قسم کا تلون تھا۔ کبھی تو جیکی کو وہ خود راتب ڈالتیں اور کبھی مارے ٹھوکروں کے بے حال کر دیتیں۔ ہر وہ گالی جو اس کو دی جاتی، احسان کے دل میں تیر کی طرح اترتی اور تپے ہوئے لوہے کی طرح پھول کر جیسے پانی میں ڈوب جاتی۔ اس وقت اس کا بس چلتا تو ایک چھوٹا سا گھر لے کر الگ ہو جاتا جس میں وہ اس کا محبوب کتا مزے کی زندگی گزارتے۔ (۶۲)

اسی طرح اشفاق احمد نے افسانہ ''گاتو'' ایک معصوم بچے اور بلی کی محبت کی کہانی ہے۔ یہ اس معصوم بچے کی داستان ہے جس کی بلی ''صاحب اختیار'' کی بیگم نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے لے لی اور بچے نے بلی کی جدائی میں جان دے دی۔

قیوم نامی معصوم بچے کی اپنی بلی سے محبت کا اندازہ اس وقت لگایا جا سکتا ہے جب اس کی بلی بیگم صاحبہ کے گھر جاتی ہے اور جب قیوم بیگم صاحبہ کے ہاں اپنی بلی لینے جاتا ہے:

> بیگم خون آلود نظروں سے قیومی کو گھورتی رہیں۔ قیومی پھر گھٹنوں کے بل گر گیا اور بیگم کا دامن چوم کر اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگا میری بلی دے دو جی۔ یہ میری گاتو ہے، مجھے مار لو جی چاہے جتنا مرضی مار لو پر میری بلی دے دو، ۔۔۔۔۔ مجھے روز مار لیا کرو جی۔ میں آپ آجایا کروں گا جی۔ میری گاتو دے دو۔ ابا جی سے پوچھ لو۔ یہ میری بلی ہے۔ انہوں نے ہی آپ کو دی ہے۔ چاہے مجھ سے سارے کام کروالیں۔ مجھ کو نوکر رکھ لیں۔ مجھے سوٹی سے مار لیں جی۔ میں کچھ نہیں کہوں گا میری گاتو۔ میری گاتو۔ مجھ کو دے دیں۔ (۶۳)

اسی طرح افسانہ ''گل ٹریا'' میں جب راوی کا کتا گم ہو جاتا ہے تو راوی اپنے بھیا سے جو کچھ کہتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ راوی کی اپنے کتے سے کتنی محبت ہے، وہ ان جملوں سے واضح ہیں:

> میں کہتا ''بھیا آدمی نہ سہی۔اس گاؤں کا ہی پتہ چل جائے جہاں ہمارا ٹی ٹی ہے، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔''۔۔۔۔۔بھیا میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے تو میں کہتا۔''اس گاؤں کو آگ لگادوں گا، اپنی کلاس ساتھ لا کر فصلیں اجاڑ دوں گا۔اس پر بھی انہوں نے ٹی ٹی نہ دیا تو افضل کے ابا جی سے کہہ کر تھانے پکڑوا دوں گا۔(۶۴)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں نہ صرف انسانی کرداروں کے دلکش اور مؤثر مرقعے کھینچے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ انسان کی جانوروں سے محبت اور انسیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔افسانہ ''تلاش'' ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں ''احسان'' جو کہ ایک چھوٹا لڑکا ہے۔وہ ایک کتے کے پلے کو تقسیم کے وقت ہندوستان سے اٹھا لایا تھا۔احسان اپنے کتے سے بے حد محبت کرتا ہے۔محبت کی انتہا یہ تھی کہ وہ انسان بھی اسے اچھا لگتا ہے جو کتے (جیکی) سے محبت کرتا ہو اور جو جیکی سے محبت نہیں کرتا اسے وہ شخص اچھا نہیں لگتا۔

احسان کی ساری کائنات ''جیکی'' ہی تھا۔جیکی کے گم ہونے کے بعد اسے لگتا ہے کہ اس نے سب کچھ کھو دیا ہے۔وہ یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ جیکی کو اس کی قسمت پر چھوڑ دیا جائے ''قران شریف کی قسم! میں نے پانچ پیسے اس لیے نہیں چڑھائے کہ وہ مجھے واپس مل جائے بلکہ اس لیے چڑھائے ہیں کہ جیکی زندہ رہے اور کوئی اسے تکلیف نہ پہنچائے۔''(۶۵)

اشفاق احمد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک افسانہ نگار تھے۔افسانہ ''تلاش'' میں احسان نامی کردار کے ذریعے اشفاق احمد نے ہمیں بتایا ہے کہ انسان محبت میں کبھی بھی جدائی کا تصور نہیں کر سکتا خواہ یہ محبت کسی جانور سے ہی کیوں نہ ہو۔احسان ''جیکی'' کے پیچھے دیوانگی کی حالت میں غائب ہو کر سب گھر والوں کو اشک بار چھوڑ جاتا ہے۔اشفاق احمد کا معصوم بچہ ''احسان'' دراصل ایک علامت ہے جس کے ذریعے انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کبھی بھی کسی اپنے کی جدائی کے کرب کو سہہ نہیں سکتا اور یہ جدائی کی کیفیت اسے پاگل بنا دیتی ہے۔

اشفاق احمد محبت کے پجاری ہیں۔ہر ایک افسانے میں انہوں نے محبت کی جھلک دکھائی ہیں۔جانوروں سے محبت کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے افسانوں میں چھوٹے اور معصوم بچوں کے ساتھ محبت کا ایک دریچہ کھل رکھا ہے۔

افسانہ ''فہیم'' پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں وہ اللہ کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں۔اور یہی لوگ ایک کامیاب اور خوش و خرم زندگی بسر کرتے ہیں۔کیونکہ ان کا بھروسا صرف اور صرف

اللہ پر ہوتا ہے ''نانا'' کی پوری زندگی ہمارے لیے ایک بہت بڑی مثال ہے۔

''نانا'' ایک ایسا انسان ہے جو دوسروں میں سکھ تقسیم کرتا ہے اور کبھی بھی اپنے لیے کچھ نہیں رکھتا اور جو کچھ ملتا ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا دیتا ہے اور پنے اللہ پر یقین اور بھروسہ رکھتا ہے اگر آج کی دنیا میں ''نانا'' جیسے لوگ پیدا ہوں تو دنیا سے تمام دکھوں کا خاتمہ ہو جائے اور یہ دنیا جنت کی مثال بن جائے۔ ''نانا'' چھوٹے اور معصوم بچوں سے بے حد محبت کرنے والے انسان تھے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''بابا'' پڑھ کر ہمیں احساس ہوتا ہے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کہ انسان کے لیے سانس کی طرح ضروری ہے اسی لیے ''ایلن'' اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر ''وحید'' کے ساتھ ایک گمنام گاؤں میں آباد ہو جاتی ہے کیونکہ اسے ''وحید'' سے گہری محبت ہے اور وہ اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ جس کا بھرپور احساس اسے ''وحید'' کی جدائی کے بعد ہوتا ہے جب وہ اس پچھتاوے سے پیچھا چھڑانے میں ناکام رہتی ہے کہ اس نے ''وحید'' کو ڈاکٹری دوبارہ جائن کرنے کا مشورہ کیوں دیا۔ یوں افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں بھی زمان کا بیٹا اپنی ماں سے شدید محبت کرتا ہے اور اس کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں بچوں کی نفسیات کا تجزیہ بھی کیا ہے کہ کس طرح خارج کا ماحول بچوں کے حساس ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس حوالے سے افسانہ ''فہیم'' اپنی مثال آپ ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ چھوٹے بچے بہت زیادہ حساس اور متجسس ہوتے ہیں اور ان کا ذہن ہر معاملے میں سوالات اٹھاتا ہے اور وہ ہر چیز کو تجسس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ ہر واقعہ کا بڑوں سے زیادہ اثر لیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر بچوں کو نظر انداز کیا جائے یا انہیں ٹوکا جائے تو ان کے ذہن پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔

''فہیم'' کو بھی اپنے نظر انداز ہونے کا پورا احساس ہے جس کا وہ کھل کر اظہار نہیں کر سکتا اور دل میں ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ اشفاق احمد کے خیال میں بچوں کی اسی حساسیت کی وجہ سے انہیں نظر انداز کرنے سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیے۔ اشفاق احمد کا افسانہ ''تلاش'' میں انہوں نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھا ہے۔ معصوم محبت انسان کی سچی محبت ہوتی ہے خواہ وہ کسی سے بھی ہو کیونکہ اس عمر میں شعور پختہ نہیں ہوتا اور سود و زیاں کے پیمانے ذہن میں نہیں ہوتے۔ اس لیے بچے جس کسی کو بھی چاہتے ہیں تو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ خواہ وہ انسان ہو یا جانور۔ ان سے محبت ان کے ذہن پر کافی حد تک اثر انداز ہوتی ہے اور اس طرح بچہ جدائی کا کرب کسی صورت میں برداشت نہیں کر پاتا۔

افسانہ ''صفدر ٹھیلا'' میں مولوی ابوالحسن صاحب ایک اہم کردار ہیں۔ مولوی صاحب اپنے معصوم بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شیریر سے شریر تر طالب علم بھی ان کے سامنے نہ بولتا تھا اور صفدر ٹھیلا جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے مولوی ابوالحسن صاحب کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہتے:

> آیا مولوی غصہ تھوک دے، لسی پی، میں نے کہا ''چل تیرے لیے بھی لسی تیار ہے مولوی جی تیرا انتظار کر رہے ہیں، مولوی جی بلاتے ہیں۔ اس نے گلاس وہیں چھوڑ دیا اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ غصے میں تو نہیں۔ (۶۶)

معصوم بچوں سے محبت کے حوالے سے اشفاق احمد کا افسانہ ''بابا'' ایک شاہکار افسانہ ہے۔ افسانہ ''بابا'' میں ایک کردار ''بابا'' نامی بزرگ ہیں۔ ''بابا'' ایک مشرقی بزرگ کی مکمل تصویر ہے۔ وہ اپنے بچوں سے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنی روایات اور مذہب سے لگاؤ اپنے بچوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے۔ وہ چھوٹے ''مسعود'' کو کلمہ سکھاتے رہتے ہیں۔ اخلاقیات کا درس دیتے ہیں گھر کا سربراہ ہونے کی وجہ سے ''ایلن'' کی روک ٹوک پسند نہیں کرتے جبکہ ''ایلن'' کے لیے ان کا غصہ وقتی ہوتا ہے۔

''بابا'' ایک ایسے بزرگ ہیں جو اپنی نسل کی بقاء کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہتا ہے اپنی آبائی زمین اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے فروخت کر دیتے ہیں۔ خود تو بلوائوں کے نیزے کھاتا ہے لیکن اپنے پوتے پر آنچ نہیں آنے دیتے:

> مسعود ریلے کی ٹھوکر سے بینچ کے نیچے جا گرا اور اس کا سر لوہے کے ایک بڑے بینچ سے بری طرح ٹکرایا۔ بابا کے پرشکن ماتھے پر ایک گہرا نشیب نمودار ہوا۔ اس کی سفید ڈاڑھی کو پھر حنا ملی اور وہ فرش پر لیٹ گیا۔ اس کی کمر کو ایک بار پھر سنگینوں نے چوما اور اس کے کندھوں سے بہت سے بوسے چمٹ گئے۔ تاریکی پھیل گئی۔ (۶۷)

المختصر اشفاق احمد کے افسانوں میں شخصی محبت کے حوالے سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں شخصی محبت کے تصور کی مکمل تصویر کشی کی ہیں اور محبت کے تصورات کو دوسرے رومانوی افسانہ نگاروں کی نسبت منفرد انداز میں پیش کئے ہیں اور یہی اشفاق احمد کے فن و فکر کا خاصا ہے۔

حوالہ جات

(۱)انور سدید''مختصر اردو افسانہ ،عہد بہ عہد''مقبول اکادمی،لاہور،۱۹۹۲ء،ص۵۰

(۲)سید وقار عظیم،نیا افسانہ ،ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڑھ،۱۹۹۰ء،ص۲۸۴

(۳)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،ماسٹر روشی،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۹۴

(۴)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،گل ٹریا،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۵۹

(۵)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،گل ٹریا،ص۶۰

(۶)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،مسکن،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص۶۶

(۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،شب خون،ص۸۶

(۸)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،توبہ،ص۱۵

(۹)اشفاق احمد،ایک ہی بولی (پھلکاری)،رشوت،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷ء،ص۷۰

(۱۰)سلیم اختر،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص۵۱۰

(۱۱)روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین،۱۰اپریل۱۹۹۲ء،ص۱۵

(۱۲)خانہ خراب،مشمولہ:نقوش،مدیر:محمد طفیل،ادارہ فروغ اردو،لاہور،جولائی۱۹۵۲ء،ص۹۳

(۱۳)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،وکھووکھ،ص۲۲۰

(۱۴)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،وکھووکھ،ص۲۱۷

(۱۵)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،برکھا،ص۱۳۱

(۱۶)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے بابا ،ص۱۳۶

(۱۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،عجیب بادشاہ،ص۱۱۴

(۱۸)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،توتا کہانی،ص۱۰۵

(۱۹)ایم سکاٹ پیک،محبت کی نفسیات،(مترجم):یاسر جواد،تخلیقات،لاہور،۱۹۹۸ء،ص۱۳۴

(۲۰)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،فہیم،ص،۱۶

(۲۱)شفیق انجم،ڈاکٹر،اردو افسانہ،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۲۰۹

(۲۲)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،توتا کہانی،ص۹۸

(۲۳)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،بندرلوگ۔ص۱۷۱

(۲۴)صلاح الدین،اردو افسانے کے جنسی رجحانات ،نگارشات میاں چیمبر ٹمبل روڈ،لاہور ۱۹۹۹ء،ص۹

(۲۵) Oxford Dictionary oxford,vol,2,Bay books,1978,P -1314

(۲۶)صلاح لدین درویش،اردو افسانے کے جنسی رجحانات،ص۱۰

(۲۷)علی عباس جلالپوری،جنسیاتی مطالعے ،تخلیقات،لاہور،۲۰۰۷ء، ص۶۸

(۲۸)علی عباس جلالپوری،جنسیاتی مطالعے ،ص۱۲۵

(۲۹)رئیس امروہوی،جنسیات،ویلکم بک پورٹ اردو بازار،کراچی،۲۰۱۳ء،ص۱۱۷

(۳۰)علی عباس جلالپوری،جنسیاتی مطالعے ،ص۷۵

(۳۱)نذیر احمد،فکشن نگار ممتاز مفتی ،دستاویز مطبوعات لاہور۱۹۹۶ء،ص۶۲۹

(۳۲)نذیر احمد،فکشن نگار ممتاز مفتی ،ص۶۳۱

(۳۳)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،بندرابن کی کنج گلی میں،ص۱۲۵،۱۲۶

(۳۴)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،تنکہ،ص۶۷

(۳۵)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،بندرابن کی کنج گلی میں،ص۱۲۳

(۳۶)غلام حسین اظہر،اردوافسانہ پاکستان میں،مشمولہ:اوراق،مدیر:وزیر آغا،افسانہ انشائیہ نمبر، ۱۹۷۲ء،جدید ناشرین چوک اردو بازار،لاہور،ص۴۴

(۳۷)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،بندرلوگ،ص۱۷۴،۱۷۵

(۳۸)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تو تا کہانی،ص۱۰۴

(۳۹)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تو تا کہانی،ص۱۰۵

(۴۰)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،چاند کا سفر،ص۲۷۱

(۴۱)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،چاند کا سفر،ص۲۷۵

(۴۲)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،چاند کا سفر،ص۲۷۵

(۴۳)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،شب خون،ص۹۲

(۴۴)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،بٹیر باز،ص۸۰

(۴۵)ول ڈیورینٹ،نشاط فلسفہ،(مترجم):محمد اجمل،فکشن ہاؤس،لاہور۱۹۹۵ء،ص۱۴۴

(۴۶)ول ڈیورینٹ،نشاط فلسفہ ،ص۱۴۵

(۴۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تو تا کہانی،ص۱۰۳

(۴۸)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تو تا کہانی،ص۱۰۳

(۴۹)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،زرناب گل،ص۲۵۳

(۵۰)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،اجلے پھول،ص۱۱۸

(۵۱)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،اجلے پھول،ص۱۲۲

(۵۲)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،اجلے پھول،ص۱۲۲

(۵۳)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،اجلے پھول،ص۱۲۲

(۵۴)اشفاق احمد،سفر مینا، پانچ میل دور،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء،ص۲۲۳

(۵۵)اشفاق احمد،عرض مصنف،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۲۰۰۶ء،ص۵۹

(۵۶)اشفاق احمد،عرض مصنف،ص۶۰

(۵۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،رات بیت رہی ہے،ص۳۴

(۵۸)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،گڈریا،ص۲۶

(۵۹)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،فہیم،ص۲۴

(۶۰)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،بابا،ص۱۵۲

(۶۱)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،بابا،ص۱۶۴

(۶۲)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تلاش،ص۳۹ ،۴۰

(۶۳)اشفاق احمد،سفر مینا،گاتو،ص۲۵۰

(۶۴)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،گل ٹریا ،ص۵۷

(۶۵)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،تلاش،ص۵۴

(۶۶)اشفاق احمد، گڈریا (اجلے پھول)،صفدر ٹھیلا،ص۱۰۰،۱۰۱

(۶۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،بابا،ص۱۵۷

باب سوم

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف

(۱) محبت اور تصوف کا تعلق: اجمالی جائزہ۔

محبت اور تصوف کے تعلق سے پہلے ضروری ہے کہ تصوف کے لغوی معنی و اصطلاحی معنی کا ذکر کیا جائے ۔تصوف کے لغوی معنی کے بارے میں علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:

> تصوف کا لغوی معنی ہے اس نے صوف کا لباس پہنا۔صوف اونی کھادی کو کہتے تھے جس کا کھردار لباس عیسائیوں کے راہب پہنا کرتے تھے۔ان کی تقلید میں مسلمان زہاد بھی اس کھادی کا خرقہ پہننے لگے۔(۱)

تصوف خیالات کا ایک نظام ہے جو مخلوق اور خالق کی حقیقت اور ان کے روابط کی ماہیت پر غور کرنے سے پیدا ہوا ہے ایک نظریے کے مطابق تصوف اصلی صورت میں مذہب کی روح اور اخلاق کی جان ہے۔

تصوف کے معنی اور تعریف کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> ''تصوف مادہ ص وف کے باب تفعل سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں اپنے آپ کو صوفیانہ زندگی کے لیے وقف کرنا۔یہ کلمہ غالباً لفظ صوفی سے براہ راست وضع کیا گیا ہے۔''(۲)

علمائے کرام کے مابین تصوف کے معنی اور مفہوم کے بارے میں اختلاف پایا جارہا ہے ۔تصوف کی اصطلاح دوسری تیسری صدی ہجری میں بغداد والوں نے ایجاد کی جس کا ذکر اردو انسائیکلو پیڈیا میں یوں لکھا گیا ہے:

> بعض کے نزدیک تصوف ،صوف سے مشتق ہے یعنی وہ لوگ صوف (گدڑی یا کمبل) کے کپڑے پہنتے تھے اس لیے صوفی کہلائے ۔بعض نے اسے اصحاب صفہ سے منسوب کیا کیونکہ انہوں نے اپنی زندگیاں خدمت دین کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور بعض نے اسے صفا (پاک) سے مشتق مانا،بعض علماء کے نزدیک تصوف کی اصطلاح دوسری تیسری صدی ہجری میں بغداد والوں نے ایجاد کی۔(۳)

تصوف ان کیفیات کا علم ہے جن کے ذریعے نفس کا تذکیہ اور اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر ہوتی ہے تاکہ انسان ابدی سعادت حاصل کر سکے۔اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہیں:

اصطلاح میں اس سے مراد ہے خواہش نفسانی سے پاک ہونا اور اشیائے عالم کو مظہر حق سمجھنا ۔ چونکہ زمانہ سابق میں ان صفات کے لوگ صوف پہنتے تھے اس لیے ان کے اعمال وافعال کو مجازاً تصوف کہنے لگے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تصوف صوف بفتح صاد سے ماخوذ ہو جس کے معنی کنارہ کش کرنے کے ہیں۔ چونکہ وہ واصلان حق ماسوی اللہ سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں ۔لہذا ان کے کام کو تصوف کہنے لگے۔(۴)

لفظ تصوف کے ماخذ کے بارے میں بھی لغات میں مختلف نظریات اور قیاس آرائیاں ملتی ہیں۔تصوف کے انسائیکلو پیڈیا میں تصوف کے ماخذ کے متعلق امام ابوالقاسم عبدالکریم لکھتے ہیں:

عربی زبان کی رو سے اس نام کی اصل کی شہادت نہ قیاس سے ملتی ہے، نہ اشتقاق سے، واضح امر تو یہی ہے کہ یہ نام لقب کی طرح ہے۔اب رہے وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ صوف کا لباس پہنے، تو اس کے لیے تصوف کا لفظ بولتے ہیں۔جس طرح قمیص پہننے کے لیے تقمص کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہ اس کے اشتقاق کی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔مگر ان لوگوں کا مخصوص لباس صوف نہ تھا۔البتہ اکثر یہی پہنا کرتے تھے۔(۵)

تصوف اس طریقے کا نام ہے جس کے مطابق ایک آدمی دنیاوی خیالات سے آزاد ہو کر مکمل طور سے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ چنانچہ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حفیظ الرحمٰن نے تصوف کی جامع تعریف ان الفاظ میں لکھی ہیں:

حقیقت میں تصوف قران کے حکم کے مطابق پیغمبر حضرت محمدؐ کی عملی زندگی کے ذریعے اپنائے گئے اس عمل کا نام ہے جس کے مطابق نبیؐ کے پاکیزہ کردار اور شیریں اخلاق کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا تزکیہ نفس کے مطابق اپنی روح کو پاک کرنا اور نفس امارہ کے اثر سے نجات پانے کے لیے خوف اور امید کے ساتھ عبادت میں مشغول ہو کر خدا سے محبت اور قربت حاصل کرنے کے لیے اور اس کی مدد حاصل کرنے کے لیے خود کو اس پر قربان کرنے کے جذبے کو اپنے اندر پیدا کرنے کا وہ طریقہ ہے جو نبی حضرت محمدؐ نے اپنائی اور بتائی، اس طریقے کے مطابق عمل کرنے کا نام تصوف ہے۔(۶)

تصوف رفعت حیات تک پہنچنے کی کوشش اور انسانی روح کی اپنے اصل تک پہنچنے کی جستجو کا نام ہے۔ڈاکٹر نجیبہ عارف تصوف کی ماہیت کے بارے میں یوسف سلیم چشتی کی کتاب تاریخ تصوف کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتی ہے:

> تصوف اس اشتیاق کا نام ہے جو ایک صوفی کے دل و دماغ میں خدا سے ملنے کے لیے اس شدت کے ساتھ موجزن ہوتا ہے کہ اس کی پوری عقلی اور جذباتی زندگی پر غالب آجاتا ہے ۔تصوف انسانی روح کا ذاتی تقاضا ہے جو اس کی گہرائی سے ابھرتا ہے اور جسے انسان کی خارجی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں۔(۷)

تصوف کیا ہے۔؟اس کا جواب تمام مباحث کو یکجا کر کے جامع انداز میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ تصوف عملی طور پر وہ طریقہ حیات ہے جس کے مقصود ذات باری تعالیٰ سے بلا واسطہ ربط پیدا کرنا ہے۔اس رابطے کے حصول کے لیے ہر شخص کو چند روحانی تجربات میں سے گزرنا پڑتا ہے جنہیں واردات قلب کہتے ہیں۔صوفیاء کا علم ان کے نفس کی گہرائیوں سے پیدا ہوتا ہے جسے مشاہدے یا کشف کا نام دیا جاتا ہے یہ علم مشاہدات اور واردات تک تو صحیح رہتا ہے لیکن اسے الفاظ کا جامہ پہنانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

محبت اور تصوف کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔محبت ایک جذبہ ہے اور معرفت ایک کیفیت ہے اور حب الٰہی تو صوفی کا ضابطہ ہے وجدان اس کا مدعا ہے اور معرفت اس کی منتہا۔محبت معرفت کی طرف لے جاتی ہے اور معرفت وصال محبوب ہے۔

محبت تصوف کے بغیر ہوسکتی ہے جبکہ تصوف محبت کے بغیر ناممکن ہے کیونکہ مجازی محبت میں تصوف کی آمیزش نہیں ہوتی اس کے برعکس حقیقی محبت میں تصوف کی آمیزش صوفیائے کرام کے نزدیک لازم ہے۔

انسانی فطرت کا سب سے قوی جذبہ محبت ہے۔محبت کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ایک مجازی اور دوسری حقیقی ۔مجازی محبت وہ ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان سے محبت کرتا ہے۔اس محبت میں احساس جسم رہتا ہے اور جسمانی وصل کی چھپی ہوئی آرزو محبّ کے وجود کو سرشار رکھتی ہے۔اس محبت کی نوعیت یہ ہے کہ جب وصل محبوب حاصل ہو جاتا ہے تو اس میں وہ شدت اور تڑپ نہیں رہتی جو کہ کوہ کن سے پہاڑ کھدواتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس محبت کو عارضی تصور کیا جاتا ہے جبکہ دوسرا رح حقیقی محبت کا ہے جسے ہم محبت بے لوث بھی کہہ سکتے ہیں۔اس میں وصل کی تڑپ اور اضطرار کی کیفیت تو مجازی محبت کی طرح ہی ہوتی ہے لیکن وصل جسمانی کی آرزو نہیں ہوتی۔یہ محبت اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔اس محبت میں محبّ کا دل ماسوا سے نہ صرف بالکل خالی ہو جاتا ہے بلکہ یہی وہ محبت ہے جس کے راستے پر چل کر صوفیاء منزل مقصود تک پہنچتے ہیں۔اسی کو حقیقی محبت کا نام دیا جاتا ہے اور اسی محبت کا رشتہ تصوف سے بہت گہرا ہے۔ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن لکھتے ہیں:

> تصوف محبت کا پیغام ہے اور یہ محبت کو کائنات کی روح مانتا ہے۔تصوف کی نظر میں یہ دنیا محبت کی جگہ ہے نہ کہ نفرت کی کوکھ سے تخریب جنم لیتی ہے جبکہ محبت تعمیر کی جنم داتا ہے۔اس

دنیا کو محبت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، نفرت کے لیے نہیں۔ انسان بھی یہاں تعمیر کے لیے آیا ہے تخریب کے لیے نہیں۔ (۸)

تصوف کی تعلیم اگر چہ اپنے پیدا کرنے والے کی پہچان اور اس کی محبت پر مرکوز ہوتی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ اس کے بندوں کے ساتھ محبت، اخلاق اور حسن سلوک کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس کائنات اور اس کی ہر چیز کو صوفی اللہ کا پرتو مانتا ہے، اس لیے وہ سب کا احترام کرتا ہے۔ آدمی جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کی ہر چیز سے محبت کرتا ہے۔ اس کی ہر یادگار اسے پیاری لگتی ہے۔ اسی طرح صوفی اللہ سے محبت کرتا ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے اللہ کی پیدا کردہ دکھائی دیتی ہے۔ تو وہ اسے اپنے محبوب کی نشانی سمجھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔

محبت کا احساس انسان کا خاصہ ہے۔ اسی لیے وہ فرشتوں پر بھی برتری رکھتا ہے۔ اگر انسان کے دل کو محبت سے الگ کر کے دیکھا جائے تو اس کے وجود کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے محبت سے پیدا کیا ہے اور محبت والا دل اس کے سینے میں رکھا۔ پھر وہ محبت کی بجائے اگر نفرت دنیا میں پھیلائے تو یہ حیرت کی بات ہے۔ تصوف میں صوفیا اللہ تعالیٰ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے محبت کا سبق دیتے ہیں۔ تصوف میں صوفیا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں اور جب وہ اپنے خالق سے محبت کرے گا تو دوسری مخلوقات سے بھی محبت کرنے لگے گا کیونکہ وہ بھی اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور ان کے وجود میں غور و فکر آدمی کو خدا کے عرفان تک پہنچا دیتی ہے۔

محبت دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور دنیا کے وجود کا سبب محبت ہے دنیا میں ہر جگہ محبت کی جلوہ گری ہے۔ یہ محبت اگر کسی کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے پر اکساتی ہے تو کسی کو جان بچانے پر بھی مجبور کرتی ہے۔ انسانی معاشرہ ہو یا جنگل کی زندگی ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں اس جذبے کی کارفرمائی ضرور مل جاتی ہے۔ یہ جذبہ ہی انسانی معاشرے کو ٹوٹ پھوٹ سے بچاتا ہے اور یہی جذبہ جانوروں کو گروہی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ محبت کا جذبہ گو عام ہے مگر اخلاق و مروت کی صفات تو انسانوں تک ہی محدود ہیں۔ یہ اور اس جیسی کچھ دیگر خصوصیات انسان کو دوسری مخلوقات سے الگ کرتی ہیں۔ اسے اشرفیت کا اعلیٰ درجہ اور مقام عطا کرتی ہیں اور اسے فرشتوں میں بھی ممتاز کرتی ہیں۔ تصوف میں انہیں انسانی خصوصیات پر زور دیا جاتا ہے کیونکہ محبت اور اخلاق کا یہ جذبہ نہ صرف ہماری شخصیت کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ معاشرے کو بھی امن و امان کا گہوارہ بناتا ہے۔

تصوف اور محبت کا آپس میں گہرا رشتہ ہے کیوں کہ تصوف کا پیغام یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو آپس میں محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔ ہر دور میں صوفیاء نے دنیا کو یہی تعلیم دی اور خود بھی اس پر عمل پیرا رہے۔ ان کے نزدیک انسان قابل احترام اور لائق تھا۔ وہ خود کسی بھی مذہب، ذات، علاقے اور رنگ و نسل کا ہو۔ اسی پیغام محبت نے ایک دنیا کو تصوف کا گرویدہ بنا دیا اور اسے ساری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی۔

اشفاق احمد ایک رومانویت پسند افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں محبت اور مقصد کو ایک منفرد انداز میں بیان کیا ہے۔مقصد اور رومانویت کے بارے میں اشفاق احمد کا مشاہدہ بہت وسیع اور گہرا ہے اور اس کو پوری جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔اشفاق احمد نے اپنی افسانہ نگاری کی ابتداء ہی میں وہ مقام حاصل کرلیا جہاں تک پہنچنے کے لیے ایک عمر لگتی ہے۔ان کے متعلق انتظار حسین لکھتے ہیں کہ:

> شاعر ہو یا افسانہ نگار مختلف مراحل طے کرتے ہوئے رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر پہنچتے ہیں جہاں انہیں اپنے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔اشفاق نے پہلے ہی مرحلے میں ''گڈریا'' جیسی کہانی لکھ ڈالی جہاں اس کے فن کی تکمیل ہوتی نظر آتی ہے۔(۹)

اشفاق احمد کو حال کی طرح ماضی کی ہر شے سے انس اور محبت ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ محبت برباد ،ناکام،مایوس اور لٹی پٹی نہیں ہے۔بلکہ ان کی یادوں میں ہر دم اک جہاں آباد ہے۔اس کے بارے میں ڈاکٹر محمد عالم خان لکھتے ہیں'' وہ ہر چیز کو دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں اور انہیں اپنے دل میں آباد کئے ہوئے ہیں۔''(۱۰)

اشفاق احمد کے افسانوں کا بنیادی مقصد محبت ہی ہے۔ان کے افسانوں میں مقصد اور محبت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ان کے افسانوں کے پس پردہ ایک ہی مقصد عیاں نظر آتا ہے اور وہ ہے انسانیت سے محبت اور انسانیت کی فلاح ،جس سے وہ فرد اور معاشرے میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔وہ خود اپنی افسانہ نویسی کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> جب میں نے لکھنا شروع کیا تو بہت کھٹن لگتا تھا،مگر آہستہ آہستہ جھجک نکلی۔پہلے تو میں نفسیاتی افسانے لکھتا تھا،وہ چھوڑ دیا،لیکن نقطہ نظر اب بھی نفسیات ہے۔میرا مقصد یہ ہے کہ انسان کے دل میں محبت پیدا ہو اور لوگ ایک دوسرے کے قریب آئیں۔معاشرے میں ہم آہنگی اور یکجہتی کی فضا پیدا ہو۔(۱۱)

ان کے اس بیان کی تصدیق ان کے افسانوں سے بھی ہوتی ہے۔انہوں نے انسانیت کی اصلاح اور ہر ذی روح سے محبت کے افسانے لکھے۔اس کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے سبھی رشتوں کو تمام رنگوں اور جذبوں کے ساتھ پیش کیا اور انسان کے کسی بھی روپ سے نفرت کرنے کے بجائے ،قابل نفرین اور حقیر جذبوں کو بھی محبت کے ساتھ پیش کیا۔

اشفاق احمد ابتداء میں رومانوی افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے اور محبت کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا لیکن بعد میں اپنی تحریروں پر تصوف کا لبادہ چڑھ دیا۔اشفاق احمد کا رومانویت سے تصوف کی طرف سفر کا جائزہ لیتے ہوئے لالہ رخ خان لکھتی ہے:

> اشفاق احمد کی تحریروں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے ابتدائی دور کی تحریروں میں محبت کا رنگ غالب ہے یعنی ان کے افسانوی مجموعے ''ایک محبت سو افسانے'' پر محبت کا رنگ چڑھا ہوا ہے لیکن ان کے آخری دور کی تحریریں اور خصوصاً ڈراموں میں ان کا رجحان تصوف کی طرف مائل نظر آتا ہے۔(۱۲)

اشفاق احمد کے افسانوں میں رومانوی تصورات سے کوئی بھی ادب کا قاری انکار نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے افسانوں میں محبت کے ساتھ ساتھ تصوف کا ذکر بھی برابر چلتا رہا۔ان کے افسانوں میں محبت اور تصوف کے حوالے سے ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے:

> اشفاق احمد کا متصوفانہ ادب بہر حال ممتاز مفتی کی جرات اظہار کا منت پذیر ہے۔ممتاز مفتی نے بارش کا پہلا قطرہ بن کر اپنی تحریروں میں کھلے بندوں تصوف سے اپنی وابستگی کا اظہار کر کے انہیں ایک راستہ فراہم کیا جس پر انہوں (اشفاق احمد) نے قدم رکھا۔اشفاق احمد ہلکے پھلکے رومان اور محبت کی کہانیوں سے نکل کر اور تحیر و اضطراب کے طوفانوں سے گزر کر بالآخر تصوف کی لطیف اور تیقن بھری فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔ان کے افسانوں اور ڈراموں میں تصوف ہلکی پھلکی ایمائیت کی صورت نمو پذیر نہیں ہوتا بلکہ کہانی کے مرکزی خیال کی طرح لہو بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتا ہے۔(۱۳)

اشفاق احمد ایک ہمہ جہت افسانہ نگار ہیں۔اردو افسانہ اشفاق احمد تک آتے آتے نظریاتی سرحدوں کو پار کر کے اپنی نئی منزلوں کی طرف روانہ ہوا۔ممتاز مفتی کے ہاں اگر نفسیاتی حوالے ملتے ہیں تو غلام عباس اور ممتاز شیریں کے ہاں زندگی کے متنوع اور حقیقی موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد ایسا نام ہے جس نے افسانے کا موضوع محبت اور اس کی کیفیات کو بنایا۔اس کی محبت عام محبت نہیں بلکہ بڑی خاص گہری اور داخلی محبت ہے جو مجاز سے سفر کرتے ہوئے حقیقت کی طرف مڑ جاتی ہے۔اشفاق احمد کی محبت کے ان گنت روپ میں جو لڑکے اور لڑکی تک محدود نہیں بلکہ اپنا وجود پھیلائے ہوئے وسیع کائنات میں پھیل جاتے ہیں ان کے زیادہ تر کردار محبت کے حوالے سے محرومیوں، المیے، افراتفری اور معاشرتی مسائل کا شکار ہیں۔ان کے افسانوں کا موحول بہت ہی عجیب و غریب ہے۔اس کے کردار بھی محبت کرنے کے بعد جدا ہو جاتے ہیں۔محبت کے موضوع کے ساتھ ساتھ جدید معاشی مسائل، نفسیاتی موضوعات اور تصوف بھی اشفاق احمد کے ہاں ہمیں نظر آتے ہیں۔ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا امتزاج نظر آتا ہے یعنی ان پر پریم چند اور یلدرم دونوں کے اثرات واضح طور پر موجود ہیں۔

اشفاق احمد کے ہاں محبت کا جذبہ تقدیس کے نور میں لپٹا ہوا دکھائی دیتا ہے۔لیکن انسان کے فطری جذبہ سے ماورانہیں ہوتا بلکہ انسان کو اس کی حقیقی صورت سے آشنا کرواتا ہے اور محبت کے پاکیزہ احساس سے اس کا تعارف کرواتا ہے جو محبت کا حسن ہے۔اس سلسلے میں غلام حسین اظہر لکھتے ہیں کہ:

> اشفاق نے محبت میں جسمانی تقاضوں کو اہمیت دی لیکن وہ انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوا۔اس کے ہاں محبت افلاطونی محبت نہیں جسمانی قربت کی پیداوار ہے۔وہ جسمانی لمس سے پروان چڑھتی ہے، جلا پاتی ہے لیکن محبت کا پیمانہ لبالب بھر جانے کے باوجود چھلکتا نہیں۔۔۔(۱۴)

محبت کا یہ احساس اشفاق احمد کے افسانوں کا خاص موضوع ہے جو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں قلم بند کیا ہے۔ان کی یہ محبت کہیں بھی نہ تو اپنے حواس کھوتی ہے اور نہ ہی اپنے اعلیٰ مقام سے نیچے آتی ہے۔بلکہ یہ قاری کے دل میں محبت کی میٹھی میٹھی تپش وحرارت پیدا کر دیتی ہیں۔جیسا کہ خالد حسین لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد کے افسانوں کا مجموعہ ایک محبت سو افسانے رگ وپے میں ایک عجیب سی لہر دوڑا دیتا تھا۔اگر آپ اسے آج بھی پڑھیں تو اس میں آپ کو محبت کی چند ایسی انتہائی دلگداز داستانیں ملیں گی جو اردو زبان میں اب تک کم لکھی گئی ہیں۔(۱۵)

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کے متنوع رنگ موجود ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ ایک محبت سو افسانے میں چھپا محبت کا یہ احساس قارئین کے دلوں میں محبت کی صحیح معانی کو سمجھنے کی سع کی گئی ہے اس سلسلے میں جمیل الدین عالی ایک اخباری کالم میں لکھتے ہیں ''ایک محبت سو افسانے ان کی ایک اہم تخلیق ہے جو عاشقانہ اور مدبرانہ بھی تھی اور ایک خاص پیغام بھی دیتی تھی۔''(۱۶)

یہ بات درست ہے کہ اشفاق احمد کے افسانوں میں مرکزی موضوع محبت ضرور ہے لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ افسانے خواب وخیال کی افسانوی دنیا میں جھولے جھولتے اور مافوق الفطرت جھیلوں میں غوطہ زن ہیں بلکہ ان کے افسانے تلخ حقائق کے بھی عکاس ہیں۔ان کے افسانوں میں ہر انسان کے دل میں پوشیدہ محبت کا حقیقی تصور صاف جھلکتا ہے۔پروفیسر وقار عظیم رقمطراز ہیں ''اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر ایسی سچی محبت کی کہانیاں ہیں جس کا نور ہر دل میں موجود ہے۔''(۱۷)

اشفاق احمد اپنے افسانوں میں محبت کے کسی ایک پہلو کو بیان نہیں کرتے بلکہ محبت کے متنوع رنگ مختلف پہلوؤں سے پیش کرتے ہیں۔یہ محبت محض مرد اور عورت کی محبت تک محدود نہیں ہے بلکہ زندگی کے سبھی رشتوں میں اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔اس سلسلے میں پروفیسر وقار عظیم ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

محبت، گھریلو زندگی، معصوم بچے۔۔۔۔۔ یہ چیزیں اشفاق احمد کے دل پسند موضوعات ہیں لیکن ایک اور موضوع جو زمانے کے اثر نے انہیں دیا ہے۔ انسانی ذہن کی اس کیفیت کی مصوری ہے جو حال کی زندگی کے انتشار اور اضطراب نے پیدا کی ہے۔ (۱۸)

اشفاق احمد کے ایک افسانے میں کئی افسانے سما جاتے ہیں۔ ان افسانوں میں ظاہری طور پر محبت کا موضوع بنیادی موضوع کے طور پر دکھائی دیتا ہے لیکن ان کے موضوعات میں ایک تنوع ہے جس کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت کا حسی تصور بے حد لطیف اور اکثیر اضلاع ہے ان کے افسانے بظاہر محبت کے مرکزی نقطے پر گردش کرتے ہیں تاہم ان کے موضوعات متنوع ہیں اور وہ محبت کی قندیل سے زندگی کے بے شمار گوشوں کو منور کرتے چلے آتے ہیں۔ (۱۹)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کے متنوع رنگ پیش کئے ہیں۔ بچوں سے محبت، والدین سے محبت، میاں بیوی کی آپس میں محبت، وطن سے محبت اور جانوروں سے محبت وغیرہ کو نہایت دلفریب انداز میں بیان کیا ہے۔ اشفاق احمد افسانہ ''فہیم'' میں درس دیتے ہیں کہ ماں باپ کو اپنے بچوں کو معاشرے کے صحت مند فرد اور شہری بنانے کے لیے ان سے پیار اور محبت کا سلوک کرنا چاہیے۔ اس افسانے میں ایک جگہ اشفاق احمد یوں لکھتے ہیں کہ:

میرے اتنے بچے ہوئے'' نانی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ مگر تمہارے نانا نے کبھی ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری، کہا کرتے تھے، بچے تو فرشتے ہوتے ہیں، ان کو مارنا گناہ ہے ۔۔۔ میں کہتی تم اسے خراب کر دو گے تو الٹا مسکرانے لگتے کہ فرشتے کبھی خراب نہیں ہوتے ۔ (۲۰)

اشفاق احمد نے اس افسانے میں بچوں پر ظلم کو گناہ کے مترادف قرار دیا ہے، اس لیے بچوں کو سمجھانے کے لیے مار پیٹ کے بجائے پیار، محبت اور شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ ورنہ بچوں میں منفی عادات پیدا ہوتی ہیں اور صحت مند زندگی گزارنے سے محروم رہتے ہیں۔

اسی طرح اشفاق احمد ایک دوسرے افسانے ''رات بیت رہی ہے'' میں محبت کی آفاقیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محبت کے سامنے تمام فیصلے، تصورات، نظریات، مباحث، افکار، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ محبت کے چھن جانے کا خوف انسان سے وہ سب کرواتا ہے جس کے کرنے کے بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں اور یہ جذبہ کسی مخصوص رنگ، نسل، قوم یا مذہب کے لوگوں تک محدود نہیں ہے بلکہ پیٹر بھی اسی لیے امریکی فوج میں ہوا باز ہے کیونکہ اس کی محبوبہ مارگریٹ کی یہی آرزو تھی، جب پیٹر اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہوتا ہے تو مارگریٹ کی تصویر کو

قریب سے دیکھ کر کہتا ہے:

> مارگریٹ نے مجھے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھو میری ٹوپی پہن کر یہ کس قدر خوش نظر آتی ہے۔ اسے ہوائی فوج سے بہت انس تھا۔ اس کی تمنا تھی کہ میں ایک اچھا پائلٹ بن سکوں۔ میں پائلٹ تو بن گیا مگر شاید اچھا نہیں! یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پرنسٹن کی گلیوں میں چلا کرو گے تو ہر بری اور بحری فوجی ہمیں سلام کیا کرے گا۔ کاش اس کی یہ آرزو پوری ہو سکتی۔ (۲۱)

اشفاق احمد کے افسانہ ''بابا'' کی بنیاد انسانیت، انسانی محبت، ہمدردی اور عزت ہے۔ اس افسانے کے کردار محبت میں گندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں تعصب و تنگ نظری کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی، انہیں رشتوں کا لحاظ ہے اور ایک دوسرے کا احساس ہے۔ افسانے کے آغاز ہی میں جب ایلن وحید کو جگاتی ہے تو اشفاق احمد کچھ یوں لکھتے ہیں:

> ایلن نے اپنی مرمریں ناک کی گلابی پھننگ کو پیار سے وحید کے گالوں کے اس ریگ مال پر پھیرا اور دو کنکنے ہونٹ اس کے ماتھے پر رکھ کر اس کو ہلانے لگی۔ درفتنہ باز ہوا۔ وحید نے ایلن کے گریبان سے باہر لٹکی ہوئی طلائی صلیب کو دیکھا اور اسے اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سورج کی کرن دبے پاؤں پھر باہر نکل گئی۔ (۲۲)

اردو نثر سے تصوف کی وابستگی کا مقصد معاشرتی اصلاح، باہمی محبت اور اخلاقی اقدار کی اشاعت ہے تاکہ لوگوں کے معاشرتی تعلقات عمدہ بنیادوں پر استوار ہوں۔ اشفاق احمد کے ہاں ابتداء سے ہی تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔ ان کے متصوفانہ تصورات کے بارے میں ممتاز مفتی یوں لکھتے ہیں:

> نور بابا صوفی منش درویش تھا۔ اس کا ڈیرا لاہور چھاؤنی کی ایک سڑک پر واقعہ تھا۔ نور بابا کا مسلک لوگوں کو کھانا کھلانا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق ڈیرے پر کیسے پہنچا۔ بابا کو اشفاق کی باتیں پسند آئیں، بابا اشفاق سے محبت کرنے لگا۔ لہٰذا اشفاق کا ڈیرے پر جانا لازم ہو گیا۔ نور بابا کہتا تھا، پتر لوگوں کو کھانا کھلاؤ جو کچھ تم خود کھاتے ہو پہلے اسے حلال کر لو خود کھانے سے پہلے دوسروں کو کھلاؤ۔۔۔۔۔ اشفاق کو بات دل کو لگی۔ اس نے بانو کو بتائی۔ دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ کھلاؤ۔۔۔۔۔ کھلاؤ۔۔۔۔ کھلاؤ۔ یوں ان کا باورچی خانہ چلنے لگا، یوں چلنے لگا جیسے رہٹ چلتا ہے۔ (۲۳)

اشفاق احمد عام آدمی کے پاس جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور اس

کو بیان بھی کر دیتے ہیں۔انسانی زندگی کے مسائل کی نہ صرف نشان دہی کرتے ہیں بلکہ اس کا آخری حل بھی بیان کرتے ہیں۔ان کی متصوفانہ رویے کے بارے میں انتظار حسین ملاقاتیں میں یوں رقمطراز ہیں:

> بات یہ ہے کہ اشفاق احمد تصوف کی بہت باتیں کرتے ہیں۔۔۔اے غافل انسان تو دانش سے پیوستہ رہ ورنہ ایسا گرے گا کہ پاش پاش ہو جائے گا۔۔۔بلی کا بچہ ماں کو پہچانتا نہیں اس سے بے تعلق ہو کر کوئی بھی چیز نظر آ جائے تو اس سے کھیلنے لگتا ہے مگر جب بھوک لگتی ہے یا کوئی افتاد پڑتی ہے تو میاؤں کرتا ہے۔ماں فوراً اس کی پکار سنتی ہے اور دوڑی آتی ہے۔غافل انسان بھی اس طرح مصیبت پڑنے پر میاؤں کرتا ہے اور خدا کو یاد کرتا ہے۔(۲۴)

اشفاق احمد کے متصوفانہ رویے پر کچھ اہل علم حضرات اعتراض بھی کرتے ہیں کہ ان کا رویہ صرف شہرت اور ناموری کے لیے ہے لیکن ان کے افسانوں اور دوسری تحریروں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''تصوف'' ان کی گھٹی میں شروع ہی سے موجود رہا ہے اور اس کا پیغام محض اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان تعلق کو برقرار رکھتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد کے ہاں تصوف سے رغبت گزشتہ پانچ چھ سالوں میں بڑھی ہے مگر پیدا انہیں برسوں میں نہیں ہوئی۔داؤ جی بھی ایک صوفی کردار ہے ''فہیم'' کے نانا جی بھی درویش کی خدمت گزاری کے لیے نوکری چھوڑ دیتے ہیں ''ایل ویرا'' میں بھی صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ملتا ہے۔اسی طرح محبت اور انسانیت سے ان کا والہانہ لگاؤ بھی انہیں صوفیوں سے محبت کا اہل بناتا ہے۔(۲۵)

اشفاق احمد ایک تصوف پسند افسانہ نگار تھے۔انہوں نے خود یہ اعتراف کیا ہے کہ میں تصوف کی طرف راغب ہو چکا ہوں۔مثلاً ماہنامہ ''ٹی وی ٹمپو'' میں اشفاق احمد تصوف کی طرف اپنے رجحان کے بارے میں خود کہتے ہیں ''شاید کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ میں صوفی ازم کی طرف اب مائل ہوا ہوں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔''(۲۶)

اشفاق احمد کے افسانوں میں تصوف متنوع رنگ میں موجود ہیں۔انہوں نے اپنے افسانے ''خود بدولت'' میں جا بجا گھمنڈ، تکبر اور غرور کی نفی کی ہے کیونکہ خرابی کی ابتداء ہی یہاں سے ہوتی ہے اور تکبر اللہ تعالیٰ کے ہاں نہایت ناپسندیدہ خیال، فعل اور عادت ہے اور اگر یہ اخلاق و عادات میں شامل ہو جائے تو پھر انسان اپنے اشرف المخلوقات ہونے کے مقام سے نیچے گرتا ہی چلا جاتا ہے۔اشفاق احمد اپنے افسانے ''خود بدولت'' میں بھی یہ لکھتے ہیں کہ جب قارون، بابے گاموں پر اپنی برتری جتاتا ہے تو وہ کہتا ہے:

> مجھے اچھی طرح سے معلوم ہے قارون کہ تم کون ہے۔؟لیکن اپنے آپ اور اپنی ذات پر اتنا

گھمنڈ نہ کر کیونکہ خدا گھمنڈ کرنے والے متکبر آدمیوں کو پسند نہیں کرتا اور اگر خدا نے اپنی مہربانی سے اور اپنے کرم سے تم کو اتنا دے رکھا تو اس میں سے کچھ اپنی قوم کے لوگوں کو بھی دے اور اس دنیا میں آخرت کی جستجو بھی کر اور اس دنیا سے اپنا حصہ آخرت میں لے جانا نہ بھول۔(۲۷)

اشفاق احمد اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ اگر تم کسی بھی معاملے میں دوسروں سے آگے ہو تو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈر کر رہو اور دوسرے انسانوں پر احسان کرنے کی کوشش کرو کیونکہ یہ سب تم پر اللہ کی عنایت ہے اور مہربانی ہے نہ کہ تمہارے اپنے افعال و اعمال کا نتیجہ ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں مسلمان ہونے کے ناطے یہ درس دیا ہے کہ ہم پر بحیثیت مسلمان اور انسان بھی کچھ باتیں فرض ہیں جن میں دوسرں پر احسان کرنا اور ان کے لیے خیر و بھلائی کے اسباب پیدا کرنا لازمی ہے اسی میں انسان کی فلاح ہے۔

(ب) اردو افسانہ اور تصوف: ایک مطالعہ

اردو ادب میں شاعری اور نثر دونوں میں تصوف کا ذکر کثرت سے ملتا ہے لیکن یہاں صرف اردو نثر میں تصوف کی بحث مقصود ہے اس لیے نثر میں تصوف کے رجحانات کے ارتقاء کے بارے میں بحث کی جائے گی۔

اردو نثر کا تصوف سے بہت قدیم رشتہ ہے اور اردو ادب نے بنیادی طور پر تصوف ہی سے فکری اڑان اور جذباتی گہرائی حاصل کی ہے۔ زندگی کی آفاقی معنویت کا احساس، ترفع حیات کی عظمت اور روح کی پرواز کی جرات ادب کے لیے تصوف کی عطا ہے۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر، حقیقت سے خواب تک کی صورت اور زمین سے آسمان تک کی حقیقت کا ادراک جس غیر مرئی باطنی سفر کا نتیجہ ہے، تصوف اس سفر کا رہنما ہے کیونکہ ادب بھی اپنی ماہیت اور کیفیت کے اعتبار سے انفس و آفاق کے مسائل پر غور کرتا اور ذات و صفات کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کی سعی کرتا ہے۔ ادب زندگی کی تصویر و تفسیر ہی نہیں، تعبیر و تشکیل بھی کرتا ہے۔ تصوف اس راستہ میں ادب کی رہنمائی اس الہامی اور وجدانی احساس کی مدد سے کرتا ہے جو اسے مذہب سے لگاؤ، مخلوق کی خدمت اور عرفان ذات کی خواہش کے نتیجے میں عطا ہوتا ہے اور یوں ادب اور تصوف دونوں بالآخر ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ منفی رجحانات کے زیر اثر دونوں کے اپنی منزل سے بھٹک کر کسی اور وادی میں جا نکلنے کے امکانات بھی موجود رہتے ہیں۔

برصغیر میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ارتقاء میں صوفیائے کرام نے بہت اہم اور نمایاں کردار ادا کیا ۔ لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے ان بزرگوں نے خواص کو چھوڑ کر عوام کی بولی اور لہجے کو اپنایا اور اسی طرح

مغلوں کے دربار میں فارسی کا سکہ چلتا رہا اور عوام کی زبان اردو یا ہندی سے آشنا ہوتی رہی۔ اردو ادب کی نثری تحریروں میں تصوف پر مبنی تصانیف کے بارے میں ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہے:

> یہ حقیقت ہے کہ اٹھویں صدی سے تقریباً گیارہویں صدی تک جنوبی ہند میں اردو نثر میں ایسے بہت سے مذہبی رسائل اور تصانیف وجود میں آئیں جو اردو نثر کے تاریخی سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔۔۔۔۔ان بزرگوں کی تصانیف میں ایک مخصوص ادبی لطافت اور روحانی کشش ہے جس نے اردو نثر کو متصوفانہ لب ولہجہ اور رفعت بخشی ہے۔(۲۸)

۱۸۵۷ء سے لے کر پاکستان بننے تک کا اردو ادب برصغیر کی ہنگامہ خیز فضا میں ارتقاء و پذیر ہوا۔ سرسید کی تحریک نے ادب میں ارضیت اور معروضیت کے جو آثار پیدا کیے، ان کے زیر اثر وقتی اور ہنگامی مسائل کو موضوع بنانے کا رجحان عام ہوا اور ادبی نثر نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں کی زد میں آ گئی جو ٹھوس اور متعین مقاصد کے تحت تخلیق کیے گئے۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں ابوالکلام آزاد کی نثر اس تہہ داری سے لبریز نظر آتی ہے جس کا مزاج تصوف سے میل کھاتا ہے۔ ان کے زمانہ اسیری کے خطوط کا مجموعہ غبار خاطر کی نثر میں صوفیانہ تفکر اور وجدان کا تال میل صاف دکھائی دیتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی برصغیر کے صوفیانہ سلسلے کی ایک جلیل القدر روایت سے منسلک تھے۔ تصوف ان کے لیے صرف ایک ادبی پیرایہ بیان ہی نہیں بلکہ اسلوب حیات کا درجہ رکھتا تھا۔ اس لیے بظاہر ان کے ہلکے پھلکے مضامین بھی اپنے اندر صوفیانہ فکر کی گہرائی اور گیرائی لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کے وہ افسانہ نگار جنہوں نے اپنے افسانوں میں تصوف کا ذکر کثرت سے کیا ہے ان میں انتظار حسین، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد بانو قدسیہ، محمد سعید شیخ اور خالدہ حسین کے نام سرفہرست ہیں۔

اردو افسانوی ادب کی تاریخ میں انتظار حسین کے افسانوی مجموعے آخری آدمی کے تمثیلی اسلوب نے نئے فنی اور فکری امکانات دریافت کیے اور فرد و جماعت، حیات و کائنات اور وجود و روح کی ثنویت کو اپنے تہذیبی تناظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ اساطیری حوالوں، تمثیلچوں ور صوفیانہ اصطلاحات کے ذریعے جدید آدمی کی بے سمتی اور بے جہتی کو بے نقاب کرتے ہیں اور اپنے تاریخی شعور اور زمانی تسلسل کے احساس کو اپنے کرداروں میں سمو کر پیش کرتے ہیں۔

یہ گویا اس مقصد کا اعلامیہ تھا جو اس مجموعے کی تخلیق کے پس پشت کارفرما تھا۔ اور اس مقصدیت کی بنیادیں اس عالمگیر مذہب سے پیوست تھیں جس پر انتظار حسین یقین رکھتے تھے۔ ایک ایسے عہد میں جب مذہب پرستی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کی علامت گردانی جاتی تھی۔ انتظار حسین نے برملا تصوف کی اصطلاحات کے ذریعے انسان کے اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> اس منزل پر پہنچ کر انتظار حسین کے فن میں کشف کا احساس ہونے لگتا ہے۔ جیسے حقیقت اپنے آپ کو از خود ظاہر کر رہی ہو یا وجود کے اسرار ایک بعد ایک بے نقاب ہو رہے ہوں۔ اس نوع کی ماورائی متصوفانہ فضا انتظار حسین کے فن کی ایک نئی جہت کی نشان دہی کرتی ہے۔ تکنیک کے اعتبار سے وہ اب سریلی دنیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ (۲۹)

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور اردو میں فلسفہ جمالیات جیسی منفرد کتاب کے مصنف ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ طرب و کرب چوبیس کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ''طرب و کرب'' میں شامل یہ کہانیاں علیحدہ علیحدہ اکائی کی صورت میں ہیں۔ مگر ایک ہی تسلسل کی ڈوری میں پروئی ہوئی ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف کہانیوں کا موضوع ابتدائے افرینشن سے لے کر عہد حاضر تک دنیا میں رونما ہونے والی ان ہستیوں کی زندگی کے حیات افروز واقعات کا بیان ہے جس کے نتیجے میں انہیں عالم برزخ میں اس محفل حسن و سرور میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ان میں گوتم بدھ بھی ہیں۔ انہی میں قابیل ابن آدم بھی ہے جس نے اس دنیائے ارضی پر پہلے گناہ کا بیج بویا۔ یہ کہانیاں اردو ادب کو ایک نئے ذائقے اور سمت سے آشنا کرتی ہیں۔ انکی بنیاد مذہبی عقائد اور اسلامی فلسفہ خیر و شر پر ہے۔ خیر جو حسن و جمال اور سرور بے خودی کا آئینہ دار ہے اور شر جس کا انجام آتش خوف و حزن کا رسوا کن عذاب ہے۔

اردو افسانوں ادب میں ممتاز مفتی تصوف کی دنیا میں ایک جانے پہچانے شخصیت ہیں اردو افسانوی ادب پر ان کے متصوفانہ رجحانات نے قابل ذکر اثرات مرتب کیے ہیں۔ لبیک ممتاز مفتی کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ ان کی اس جرات پر ادب کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا کہ انہوں نے بدن اور مادے سے ماورا حقیقتوں کا انکشاف کر دیا۔ اور صوفیانہ واردات کو، جو پہلے رجعت پسند مذہبی حلقوں کا پامال اور فرسودہ مضمون سمجھی جاتی تھی، ادب کا حصہ بنا دیا۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف تو ممتاز مفتی کے تصوف کے بارے میں یہاں تک لکھتی ہیں کہ:

> لبیک کے دور رس اثرات اردو ادب پر ابھی تک دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں بھی صوفیانہ رنگ کا عمل دخل اسی ذہنی فضا اور ماحول کا اثر ہے جو اس کتاب کے حوالے سے پاکستانی معاشرے میں پیدا ہوا۔ اگر ممتاز مفتی یہ کتاب نہ لکھتے تو

شاید اشفاق احمد کو بھی اس موضوع (تصوف) پر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوتی اور اصغر ندیم سید
کے ڈرامہ سیریلز میں بھی مزاروں اور قوالیوں کے منظر دکھائی نہ دیتے۔(۳۰)

لبیک میں تصوف کا کوئی خاص نظریہ موجود نہیں اور نہ ہی اس میں تصوف کے اصول وقوانین کا ذکر یا بحث ملتی ہے بلکہ اس میں مفتی نے احساسات وتاثرات کو پیش کیا ہے۔جس کی وجہ سے اس کتاب نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔

اردو فکشن میں صوفیانہ تصورات ورجحانات کے حامل افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام قدرت اللہ شہاب کا بھی ہے۔ان کا تصوف آمیز افسانہ ''ماں جی'' ہے جس میں ایک صوفیانہ کردار ماں جی کا ہے۔ماں جی ایک ایسی درویش صفت مسلمان عورت کا کردار ہے جس نے مزدور کی بیٹی ہونے سے لے کر گورنر کی بیٹی بننے تک زندگی کے سب رنگ دیکھے۔ماں جی نے دکھ، تکلیف، مفلسی اور پھر امارت اور اقتدار دیکھا لیکن اس کی شخصیت کی درویشی اور فقر کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ماں جی ہمیشہ اپنی اولاد کو اللہ کا مال کہتی اور کبھی براہ راست اپنے بچوں کے لیے دعا نہ مانگتیں، پہلے دوسروں کا بھلا، دوسروں کی خیریت طلب کرتیں پھر اپنی اولاد کا بھلا چاہتیں۔ہر جمعرات کو مساجد میں گیارہ پیسے کا تیل چراغوں کے واسطے بھیجوانے والی، صبر وتحمل کا پیکر، سادہ مزاج، نیک طنیت ماں جی کا کردار اس صوفیانہ طرز نگارش کا آئینہ دار ہے جو اسلامی طرز حیات کے سرچشمہ سے پھوٹتا ہے یہاں شریعت وطریقت میں، ظاہر وباطن میں کوئی دوئی نہیں۔

افسانوی ادب کے متصوفانہ تصورات کا تذکرہ کرتے ہوئے اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا تذکرہ ناگزیر ہیں۔ان دونوں کا تعلق قدرت اللہ شہاب کے حلقہ ارادت سے ہے اور انہوں نے نے شہاب کے روحانی دائرہ اثر کے تحت اپنے فن کا ارتقائی سفر طے کیا ہے مگر ان کا متصوفانہ ادب بہر حال ممتاز مفتی کی جرات اظہار کا منت پذیر ہے۔اشفاق احمد ہلکے پھلکے رومان اور محبت کی کہانیوں سے نکل کر اور تحیر اور اضطراب کے طوفانوں سے گزر کر بالآخر تصوف کی لطیف اور تیقن بھری فضا میں پہنچ جاتے ہیں۔اشفاق احمد کے افسانوں اور ڈراموں میں تصوف کہانی کے مرکزی خیال کی طرح خون بن کر اس کی شریانوں میں دوڑتا ہے۔انہوں نے مغربی فکر کی بے بنیاد ترقی اور مادی واقتصادی فوائد پر قائم رہنے والے نظام کے کھوکھلے پن اور سطحیت پر شدید تنقید کی ہے اور اس کے مقابلے میں مشرقی روحانیت، تہذیبی اقدار کی گہرائی اور وسعت، آپس کی پیار محبت اور ہمدردی کی حرارت سے رونما ہونے والے معجزوں کو اجاگر کر کے مغربی تہذیب پر مشرقی تمدن کی افضلیت کو واضح کیا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں مرشد کی تلاش، ذکر کی حقیقت اور باطنی ارتقاء جیسے مراحل تصوف بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔انہوں نے اپنے افسانے ''بولتا بندر'' میں ڈارون کے نظریے ارتقا پر شدید تنقید کی ہے اور ارتقاء کے قرآنی تصور کو پیش کیا ہے۔

اسی طرح طلسم ہوش افزا میں شامل افسانہ ''کوٹ ودوپاور ہاؤس'' میں اشفاق احمد نے انسانی اجتماعات میں باہمی محبت یقین اور ایثار کی فضابندی سے ایک ایسی توانائی پیدا ہونے کا نظریہ پیش کیا ہے۔جس سے ہر طرح کا فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اشفاق احمد کے شانہ بشانہ کام کرنے والی بانو قدسیہ کی اردو فکشن میں خدمات نا قابل فراموش ہیں۔بانو قدسیہ کی تحریریں تصوف کے بغیر ادھوری نظر آتی ہے۔ان کا مشہور زمانہ ناول راجہ گدھ ہے جس میں انہوں نے کائنات میں انسان کی تخلیق اور اس کی مسلسل جستجو،ابدی زندگی کی خواہش،اس کی فکری بے سمتی اور کج روی،ذہنی انتشار،احساس محرومی اور عشق لاحاصل سے پیدا شدہ دیوانگی پر مفصل بحث کی ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان راجہ گدھ میں موجود معنویت تہ داری اور مزیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> خاص طور سے تصوف اور روحانیت کے حوالے سے یہ ناول ایک جرات مندانہ ادبی مہم جوئی ہے اور اپنی ذات میں اور یجنل بھی،کیوں کہ اس میں ایک بیمار معاشرے کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ نظریاتی کمنٹ منٹ بھی ہے جس کے ڈانڈے سیکولر خیالات کے مقابلے میں ہماری اپنی روحانی جڑوں سے اتصال کرتے ہیں۔(۳۱)

بانو قدسیہ اس ناول میں انسان کی مجموعی فکری اور روحانی پس ماندگی کے وجوہات تلاش کرنے کی جدوجہد میں اس نتیجہ تک پہنچی ہیں کہ جدید طرز حیات کے اکثر مسائل کا حل انسان کے روحانی خلا میں پوشیدہ ہے۔جدید سائنس دان اپنی تحقیقات کے باوجود ابھی تک اس بات کا کھوج نہیں لگا پائے کہ انسان کی جسمانی اور روحانی نشوونما رزق حرام سے متاثر ہوتی ہے۔رزق حرام وہ ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔رزق حرام سے جو Genes تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نا امید بھی ہوتے ہیں۔نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل سفر کرتے ہیں تو ان Gense کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے دوسری تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں بھی تصوف کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔چنانچہ ان کے افسانہ ''مراجعت'' میں متصوفانہ خیالات نمایاں نظر آتے ہیں۔اس افسانے میں ایک بیوہ عورت (فاطمہ عزیز) اور اس کے بیٹے (زاہد اقبال) کا ذکر ہے زاہد اقبال نے بے دینوں کے کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔اس کے ماں کو بہت سے لوگوں نے سمجھایا تھا کہ مشنری کالج میں تعلیم مت دلوانا لیکن فاطمہ عزیز کو تو شوق تھا کہ بیٹا فر فر انگریزی بولے۔

فاطمہ عزیز لاکھ کوشش کرتی ہے کہ اس کا بیٹا اللہ تعالیٰ کو دل وجان سے مان لے لیکن بیٹے پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔آخر میں زاہد اقبال کا دل اس کے استاد پروفیسر اعجاز کی کوششوں سے اللہ تعالیٰ کو ماننے کا قائل ہو جاتا ہے۔چنانچہ

بانو قدسیہ افسانہ ''مراجعت'' میں لکھتی ہے:

میاں ایک ذرہ بھر مفروضے پر تکیہ کر کے جس کی ہیت نا معلوم ہے ایسے مفروضے پر تکیہ کر کے سائنس دان کل کائنات کا سفر کر رہے ہیں۔ تو کیا تم ایک ایسا مفروضہ اپنی روح کے آرام، اپنی سائیکی کی بقا، اپنے شعور کی جلا کے لیے پال نہیں سکتے جس کا آرام کلی طور پر تمہاری ذات کو ہوگا۔

''کیسا مفروضہ؟''

آج سے اس مفروضے پر زندگی بسر کرو کہ خدا ہے۔ تمہارے لیے اس سے زیادہ اور کسی مفروضے کی ضرورت نہ ہوگی''

سنتے ہیں کہ زاہد اقبال نے اس دن کے بعد پھر کبھی اپنی ماں کو الٹی میٹم نہیں دیا۔ (۳۲)

اردو فکشن میں تصوف سے وابستہ افسانہ نگاروں کی صف میں کھڑے ہونے والے معروف افسانہ نگار محمد سعید شیخ ہیں۔ ان کے ہاں ایک زیریں لہر کی صورت میں متصوفانہ رجحانات کا بہاؤ صاف نظر آتا ہے۔ وہ مغربی فلاسفروں سے بھی متاثر دکھائی دیتا ہے اور مشرقی تصوف سے بھی بے خبر نہیں چنانچہ ان کے متعلق ڈاکٹر نجیبہ عارف لکھتی ہیں:

وہ جرمن ادیب Hermann Hesse سے بھی متاثر ہیں جس کی تحریروں میں مابعد الطبیعیاتی موضوعات سے گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔ وہ تلاش ذات اور وجودی سچائیوں کی کھوج میں مشرقی تصوف کی پر اسرار دنیاؤں میں بھی جھانکتا ہے اور سدھارتھ کی زندگی اور فلسفہ پر ناول لکھ کر اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ محمد سعید شیخ کے خیال میں عمر کے ایک خاص حصے میں پہنچ کر ہر شخص کو اپنے جسم و جان پر مادے کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور وہ زندگی کے توازن کے حصول کے لیے مابعد الطبیعیات سہاروں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ (۳۳)

چنانچہ ان کے اکثر افسانوں میں روحانی تسکین واضح طور پر دکھائی دیتی ہے ان کے بیشتر افسانوں کا مرکزی کردار صبر، قناعت، تحمل، ضبط نفس اور بھلائی کی مثبت اقدار سے ترکیب پاتا ہے۔ وہ زندگی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ مگر باطن میں اسے ایک ایسی نیک سرشت کی رہنمائی حاصل ہے جو ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر بے اختیار اسے روحانی مرشد کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے اور مادی زندگی کی تمام تر کامیابیوں سے بے نیاز کر کے ایک نئی تشنگی کے

ذائقے سے اشنا کرتی ہے۔ان کا افسانہ ''روشنی'' تصوف کی سیدھی سادی اور عملی تصویر پیش کرتا ہے انہوں نے بڑی سادگی سے انسان کی پیچیدہ نفسی کیفیات کے بدلتے ہوئے رنگوں کی تصویر کشی کی ہے۔

اردو افسانوی ادب کی تاریخ قرۃ العین حیدر کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔انہوں نے تہذیبی ،عمرانی اور تاریخی حوالوں سے بنی آدم کے فکری اور روحانی سفر کی داستان بیان کی ہے۔مگر ''گردش رنگ چمن'' میں ان کا یہ سفر تصوف کی وادی میں خیمہ زن ہوتا دکھائی دیتا ہے۔جس کے متعلق امجد طفیل لکھتے ہیں:

> تشخص کی تلاش کا عمل ، ہندو تہذیب ، ہندوستان میں پروان چڑھنے والی اسلامی تہذیب ،اپنی نسلی بنیادوں کی تلاش ،کربلا کے واقعے سے اپنی خاندانی نسبت اور اپنی جڑوں کی تلاش میں صدیوں کے سفر کے بعد ایسا لگتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے آخر کار تصوف میں پناہ لی ہے جس کا واضح اظہار ان کے آخری ناول ''گردش رنگ چمن'' کے اہم کردار ''میاں جی'' سے ہوتا ہے۔(۳۴)

''میاں جی'' کے کردار کے روپ میں قرۃ العین حیدر نے تصوف کی روح کو پیش کیا ہے اور عہد جدید کے انسان کی پریشانیوں اور تکالیف کا حل تصوف اور روحانیت میں تلاش کیا ہے۔اس طرح ہمیں قرۃ العین حیدر کی تحریر میں فرد وقت کے پنجے میں جکڑا نظر آتا ہے۔''میاں جی'' کا کردار اس شکنجے سے رہائی کی ایک صورت ہے۔ایسا لگتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے اپنی ساری جستجو اور تلاش کے بعد آخر کار تصوف میں پناہ لی ہے اور تمام حوالوں کو رد کر کے اپنی شناخت اور پہچان تصوف اور روحانیت کے حوالے سے کرانے کی کوشش کی ہے۔یوں لگتا ہے میرے بھی صنم خانے سے شروع ہونے والا تشخص کی تلاش کا سفر آخر میں گردش رنگ چمن کے میاں جی کے آستانے پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی منطقی و استدلالی نقطہ نظر رکھنے والی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں ۔ان کا اچانک تصوف کی طرف رجوع کرنا کسی باطنی کایا کلپ کی نشانی ہے۔یہ کایا کلپ گہرے اور بھرپور مطالعے کی متقاضی ہے۔

اردو افسانے میں تصوف کے حوالے سے ایک اور معروف شخصیت خالدہ حسین کی ہے۔ان کے افسانے جس تمثیلی اور علامتی اسلوب میں لکھے گئے ہیں وہ کسی گہری روحانی واردات کے ترجمان ہیں۔اس واردات کی نوعیت معروف یا رسمی معنوں میں صوفیانہ ہو نہ ہو۔مگر ان کی تحریر کے رگ و ریشے میں اس اضطراب کی جھلک ہے۔جو مادی حقائق سے بلند تر ہو کر زندگی کے قلب میں اترنے کا شوقین ہوتا ہے۔

تاہم اردو نثری ادب کے متصوفانہ رجحانات کا اظہار جدید دور کی بے سمتی اور بے معنویت میں کیا رنگ اختیار کرتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کم از کم اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ مکمل ہونے کا انتظار کر لینا چاہیے اس لیے کہ حالات وواقعات ہی نہیں، خیالات ورجحانات میں بھی جس تیزی سے تبدیلی رونما ہو رہی ہے، اس کا فوری طور پر قیاس میں آنا آسان نہیں۔ تاہم انسان بے اختیار اپنے روحانی خلا کی طرف متوجہ ہو رہا ہے اور گزشتہ چند صدیوں کے دوران سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسان کو جس طرح مشین میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسانی شعور اب ایک لمحے کے لیے رک کر نفع ونقصان کا گوشوارہ تیار کرنے کی مہلت چاہتا ہے۔

(ج) اشفاق احمد کے افسانوں میں تصوف کے ذاتی تجربات کی نوعیت:۔

اشفاق احمد نے اپنی تحریروں میں تصوف پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس طرح ٹی وی پروگرام پر بھی تلقین شاہ کے نام سے تصوف میں اپنے ذاتی تجربات کا اظہار کیا ہے۔ تصوف سے تعلق رکھنے والے ہر ایک صوفی کا ایک الگ نقطہ نظر ہوتا ہے اور الگ راستہ ہوتا ہے۔ اشفاق احمد تصوف میں اپنی ذاتی تجربات کا اظہار کرتے ہوئے اپنی کتاب عرض مصنف میں رقم طراز ہیں:

> تصوف یا صوفی ازم ہے کیا چیز اور اس کا انسان سے یا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے ۔۔۔۔ مختصر طور پر یہ جان لیجئے کہ تصوف ایک علم ہے جس کا موضوع ہے کہ ان طاقتوں اور ہستیوں کی حقیقت معلوم کی جائے جن پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے اور جن کو دیکھے بغیر اور جن کا ثبوت دیے بغیر ہم پر فرض ہے کہ ہم ان کو مانیں۔ وہ طاقتیں اور ہستیاں ہیں اللہ ،فرشتے، الہامی کتابیں، رسول، قیامت کا دن اور حیالات بعد الموت۔ (۳۵)

اشفاق احمد تصوف کا کافی علم رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیاوی علوم سیکھنے کے لیے پہلے لکھنا پڑھنا ضروری ہوتا ہے جبکہ تصوف حاصل کرنے کے لیے پہلے اپنی زندگی کو ظاہری اور باطنی دونوں طرح پاکیزہ بنانا پڑتی ہے۔ اس کے بعد اخلاق اور کردار کو سنوارنا پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ کوشش کرنی چاہیے، جتنی بھی اخلاقی برائیاں ہیں وہ سب دور ہوں اور جتنی بھی خوبیاں ہیں وہ سب پیدا ہو جائیں۔ ان کے ہاں صوفی ازم کے لیے ریاضت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے جب ان تمام چیزوں میں پختگی پیدا ہو جائے تو پھر علم الٰہی کی جھلکیاں ملنے لگتی ہیں۔

اشفاق احمد تصوف میں ذاتی تجربات کے حامل ادیب ہیں۔ وہ تصوف اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے میں تفریق کے قائل ہیں وہ لکھتے ہیں:

> تصوف یا صوفی ازم اور دوسرے علموں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ اور علم تو پہلے حاصل کیے جاتے ہیں اور پھر ان پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تصوف عین اس کے الٹ ہے۔ اس میں

پہلے عمل کیا جاتا ہے اور پھر علم حاصل ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ صوفی ازم میں پہلا حکم سننا ہے پھر اس پر ایمان لانا ہے اس کے بعد عمل کرنا ہے اور اس عمل کے دوران جاننا خود بخود وارد ہونے لگتا ہے۔ علم خود بخود حاصل ہونے لگتا ہے۔ (۳۶)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں، ڈراموں اور دوسری تحریروں میں تصوف کو منفرد انداز میں بیان کیا ہیں ۔ اشفاق احمد جو مزہ اور لطف اس ڈھنگ سے کھینچ سکتے تھے، وہ بلا تصوف کے کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ تصوف ہی کی وجہ سے انہوں نے اپنے افسانوں اور ڈراموں کا رخ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ صوفی ازم اور دوسرے نثر نگاروں میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے بارے میں غالب احمد ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> اشفاق احمد نے اپنے افسانوں اور ڈراموں کا رخ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ اور ''داستان سرائے'' کو ''صوفی تلقین شاہ'' کے دربار میں بدل دیا تھا۔ اب بابے کے دربار میں جو مزا جو لطف اشفاق احمد کھینچ سکتے تھے وہ دوسرے ڈھنگ کے افسانوں اور ڈراموں میں کیسے حاصل کر سکتے تھے۔ اشفاق احمد کے تمام زمانے اور تمام افسانے اور ڈرامے تلقین اور نصیحت کے رنگ میں لکھے گئے اور زاویہ نگاہ خراج عقیدت پر رہا۔ ان سے میرا گلہ تو صرف یہی ہے ۔ باقی وہ نثر نگاروں کی صف میں بہت اہم حیثیت کے مالک ہیں ۔ یہ اعزاز ان سے کون چھین سکتا ہے۔ (۳۷)

صوفی کا موضوع امن، محبت اور بھائی چارہ ہوتا ہے۔ اشفاق احمد بھی اس قسم کے صوفی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ امن اور محبت کو سینے سے لگائے رکھا، کوئی بھی پیرایہ اظہار ہو ان کا موضوع یہی رہا۔ وہ انسانوں سے دور رہ کر اللہ ہو، اللہ ہو کے ورد و ذکر کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسانوں میں رہ کر انسان اللہ کو بھی یاد کرے اور انسانوں کے لیے آسانیوں کا سبب بھی بنے یہی حقیقی تصوف ہے۔ محمد اکرم چغتائی اشفاق احمد کے متصوفانہ تصورات کے بارے میں لکھتے ہیں ''یہ بحث تو چلتی رہے گی کہ اشفاق احمد صوفی تھے، یا متصوف یا مستصوف، لیکن اس ضمن میں ایک بات تو طے ہے کہ وہ دانش برہانی کے مقابلے پر دانش نورانی کے قائل تھے۔'' (۳۸)

اشفاق احمد ساری انسانیت پر مہربان تھے۔ وہ دوسرے لوگوں کو نہ خود تکلیف دیتے تھے اور نہ دوسروں کو برداشت کر سکتے تھے۔ وہ دوسرے لوگوں کو آسانیاں عطا کرنے کوشش میں لگے رہتے۔ ان کی اہلیہ بانو قدسیہ لکھتی ہیں ''اشفاق احمد کون تھے، کیسے تھے، وہ اپنے آپ کو تلاش کر رہے تھے، عرفان ذات کے شوقین تھے۔ وہ دوسروں کو آسانیاں دینا چاہتے تھے۔'' (۳۹)

اشفاق احمد کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائی دور کی تحریروں میں تصوف کو خاص موضوع کا درجہ نہیں دیتے تھے بلکہ بعد کی تحریروں میں انہوں نے صوفی ازم کی طرف خاصی توجہ دی۔ یہ بات ان کے افسانوں سے بھی ثابت ہے اور ان کے دوستوں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے جیسا کہ اے حمید لکھتے ہیں:

> نوجوانی کے زمانے میں مجھے یاد نہیں کہ اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو البتہ درمیانی عمر میں آ کر اشفاق احمد نے تصوف کی باتیں شروع کر دی تھیں ۔ یہ باتیں کسی ایسے مسالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہو بلکہ ایسے پیر باصفا کی باتیں تھیں، جس نے حقائق و معارف کی منزل پالی ہو۔ نفسیاتی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا جو اسے اپنا مرید بنانے کے بجائے پیر کامل بنا دے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھ لیں کہ اشفاق احمد خود پیر بننا چاہتا تھا۔ (۴۰)

اشفاق احمد نہ محض انسان کو دنیا اور آخرت کے تعلق کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں بلکہ انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے نجات دلاتے ہیں۔ چنانچہ من چلے کا سودا میں کہتے ہیں ''صوفی ازم اختیار کرنے سے آپ کے اندر دوئی نہیں رہتی ۔ آپ ٹکڑوں میں اور ٹوٹوں میں تقسیم ہونے سے بچ جاتے ہیں اور Dichotomy سے نکل جاتے ہیں۔'' (۴۱)

اشفاق احمد کے ہاں تصوف نہ محض اپنے آپ کو سنوارنے کا نام ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسروں کے بارے میں بھلائی اور بہتر رویے کا نام تصوف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرد اور سماج کے تعلق کو بہتر بنانے کے لیے اخلاقی اقدار کو اپنانے کی بات کرتے ہیں اور انہی روایات سے تعلق مضبوط رکھنے کی تلقین کرتے ہیں اور اسی پر ان کے تصوف کی بنیاد ہے۔ اس کے متعلق طارق اسماعیل ساگر لکھتے ہیں کہ:

> فرانگی دانش کے تہذیب یافتہ، جدیدیت کو اوڑھنا بچھونا بنانے والوں کو اس نے اسلاف کی روایات سے محبت کا درس دیا ہے۔ اس نے بتایا کہ کوئی درخت اپنی جڑوں سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ دنیا کا سب سے قیمتی ''منی پلانٹ'' بھی برگد جیسی چھایا نہیں دے سکتا۔ یہی فلسفہ صوفی اشفاق احمد کی تعلیمات کی بنیاد تھی اور ایسی مضبوط بنیادوں پر استوار عمارتیں صدیوں اپنا وجود برقرار رکھتی ہیں۔ (۴۲)

اشفاق احمد تصوف میں ذاتی تجربات رکھنے والے ادیب تھے اس لیے ان کے ہاں فقیری کا راستہ آسان راستہ نہیں ہیں۔ ان کے مطابق فقیری کے راستے میں کئی آزمائشیں اور کٹھن گھڑیاں آتی ہیں اور سب سے زیادہ انسان کو اپنی ذات سے ہوتا ہے کیونکہ انسان کا اپنی ذات پر قابو نہیں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر گناہ انسان کی سرشت میں

شامل ہے جس کے بارے میں اشفاق احمد ''شاہلا کوٹ۔ تلقین شاہ'' میں رقم طراز ہیں ''بڑی سے بڑی ہستی کو اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ خطرہ آخری دم تک موجود رہتا ہے۔'' (۴۳)

تصوف کا مطلب کشف و کرامات یا راہبانیت نہیں ہے نہ ہی اس کا رشتہ روحانی طاقت حاصل کرنے سے ہیں بلکہ اشفاق احمد کے ہاں صوفی ازم مخلوق خدا سے بھلائی و احسان اور خدمت کا نام ہے اور جوں جوں انسانی فلاح و بہبود کے لیے انسان کے قدم اٹھیں گے اس کے راستے خود بخود ہموار ہوتے چلے جائیں گے۔ وہ حیرت کدہ میں یوں لکھتے ہیں کہ:

> جس قدر انسان دنیاوی خواہشات کا پابند ہوگا اور رضائے الٰہی کا کم متلاشی ہوگا۔ وہ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں سے دوچار ہوگا۔ جوں جوں اعلیٰ درجوں میں نفس کی تنظیم کرتا پہنچے گا، اس کے امتحان، اس کی آزمائش، اس کی منزل مشکل ہوتی جائے گی۔ دنیا تو اللہ کی محبت کی آزمائش گاہ ہے۔۔۔۔۔ کوئی نہ کوئی آشفتہ سر نار دنیا سے گزر کر کندن ہوتا ہے۔ (۴۴)

اشفاق احمد کی ذہنی اُپج بہت وسیع ہے اس لیے ان کو ماضی، مستقبل اور حال کا مکمل شعور و وجدان حاصل ہے۔ وہ خود کو مذہبی تبدیلی و وجدان کی زد میں محسوس کرتے ہیں اور یہی تغیر ان کو عاجزی، درگزر، محبت، پیار، توکل اور اخلاقیات کی طرف لے گئے۔ اس تبدیلی کی بنا پر وہ بابوں کے پاس بھی جاتا ہے، پیامبر بھی ہے، محبِّ وطن بھی اور ماضی سے لگاؤ بھی رکھتا ہے۔ اشفاق احمد کے تحریروں میں تصوف کے ذاتی تجربات کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

> عید کے روز میں اپنے بیٹو یاسر، عمر اور علی کے ساتھ اشفاق احمد اور بانو آپا سے ملنے ماڈل ٹاؤن لاہور میں ان کی رہائش گاہ ''داستان سرائے'' گیا تو تھوڑی دیر بعد تین ملنگ اندر داخل ہوئے۔ ہاتھوں میں کڑے، گلے میں مالا، جسم پر سیاہ چادر، آتے ہی اشفاق احمد کے پاؤں میں بیٹھ گئے اور اپنے اس گرو کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔ مجھے علم تھا کہ اشفاق احمد کے عقیدت مندوں میں بہت اضافہ ہو چکا ہے لیکن یہ علم نہیں تھا کہ باقاعدہ پیری مریدی کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے مگر یہ پیری مریدی وہ نہیں تھی جس کے بدنما مظاہر ہمیں اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں بلکہ جو چیلے اشفاق احمد کے قدموں میں بیٹھے تھے ان میں ایک یحییٰ خان نام کا چیلا بھی تھا جو جہاں گرو ہے اور کتابوں کا مصنف بھی ہے گرو اور چیلے کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بہت وکھری ٹائپ کی تھی۔ اشفاق احمد کا تصوف عام ڈگر سے ہٹ کر تھا اور ان کے چیلے بھی اپنے رویے میں عام ڈگر سے ہٹے ہوئے تھے۔ (۴۵)

اشفاق احمد کے ہاں انسان کے مٹی سے کندن بن جانے کے مراحل طے کرنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ تصوف کی راہ پر چلنا آسان نہیں ہے بلکہ اس میں مسلسل صبر واستقامت کی ضرورت ہوتی ہے اس میں سب سے بڑی آزمائش انسان کا اپنا نفس اور وجود ہوتا ہے جس قدر انسان اپنے نفس پر قابو پائے گا اسی قدر منزل مقصود اس کے قریب آتی جائے گی۔

اشفاق احمد کا تصوف اچھوتے موضوعات اور منفرد مباحث پر مبنی ہیں۔ انہوں نے نہ صرف تحریر بلکہ اپنے عمدہ اور مسحور کن انداز گفتگو سے بھی لوگوں کی راہنمائی کی۔ انہوں نے جس صوفیانہ انداز سے غیر محسوس طور پر خدمت خلق، صلہ رحمی، محبت، احسان اور خلوص کے رویوں کو فروغ دیا۔ اسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور اخلاقی تعلیمات کا ہمیشہ درس دیا۔ نیاز خان اپنے ایم فل کے مقالے میں لکھتے ہیں:

> خدمتوں، کاوشوں، نصیحت آمیز باتوں اور صوفیانہ و اخلاقی تعلیمات کی وجہ سے آج بھی اشفاق احمد ہمیں ادب کے کارواں میں زندہ جاوید نظر آتے ہیں، جس کی تحریر میں ایک چاشنی، لطف، مزہ، نصیحت اور اخلاقی رنگ نظر آتا ہے۔ آج بھی ان کے نہ ہونے کے باوجود ادب کا قاری ان کی تحریر کو پڑھ کر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اس میں کیا بات کہی گئی ہے اور کون سے پہلو یا خصوصیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فن اور شخصیت میں اخلاقی تعلیمات کا پرتو ملتا ہے اور ان اخلاقی تعلیمات کو بیان کرنے میں وہ کسی بات کو آڑے نہیں آنے دیتے۔ (۴۶)

اشفاق احمد کے افسانوں اور دوسری تحریروں میں تصوف کے منفرد مباحث پڑھنے کو ملتی ہیں۔ انوکھی بات کہنا اور لوگوں کو حیران کر دینا اشفاق احمد کی خاصیت ہے۔ وہ ہمیشہ ہی کوئی نئی اور انوکھی بات کہتے ہیں۔ شاید انہیں دوسروں کو حیران کرنے میں لطف اور مزہ آتا ہے۔ یہ خوبی صرف ان کی تحریروں میں ہی نہیں بلکہ ان کی حقیقی زندگی میں بھی صاف جھلکتا ہے۔ اس سلسلے میں سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں ''اشفاق احمد سے جب بھی ملاقات ہوئی انہوں نے میرے ذہن پر خوش کن اثرات مرتسم کیے۔ تحریروں میں بھی اور ذاتی طور پر بھی میں ہمیشہ ان کا مداح رہا ہوں۔'' (۴۷)

اشفاق احمد کا نام رویے کی وجہ سے متنازعہ فیہ بن چکا ہے کیونکہ ان کے اکثر معترضین یہ گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے متصوفانہ رویے کو بعض عملی مقاصد کے حصول اور سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنایا۔ وہ ضیاء الحق کے دور میں اپنے تازہ تخلیقی ٹی وی ڈرامے کے ذریعے قاتلوں کو معافی دینے کی اپیل کرتے رہے، ملا کو ہیرو بناتے رہے، آئن سٹائن کو صوفی ثابت کرتے رہے، مغربی علوم وفنون کی نارسائی کا ذکر زور شور سے کرتے رہے وغیرہ۔ اصل ماجرا یہ ہے کہ اشفاق احمد کے ہاں تصوف سے رغبت گزشتہ ایک دو عشروں میں بڑھی تو سہی مگر پیدا انہیں برسوں میں

نہیں ہوئی، داؤ جی بھی ایک صوفی کردار ہے، ''فہیم'' کے نانا جی بھی درویش کی خدمت گزاری کے لیے ملازمت چھوڑ دیتے ہیں۔ ''ایل ویرا'' میں بھی صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ملتا ہے۔

اشفاق احمد کا افسانوی مجموعہ اجلے پھول میں ایک افسانہ ''ایل ویرا'' کے نام سے ہیں۔ اگر اس افسانے کو پڑھا جائے تو اصل میں یہ روم کے متعلق ایک رپورتاژ ہے۔ اسی میں اشفاق احمد صوفی کے دل اور یوگی کی آنکھ کا ذکر ان الفاظ میں بیان کیا ہیں:

> مشرق کے لوگ بڑے خدا پرست ہوتے ہیں اور ہر چیز منجانب اللہ تصور کرتے ہیں۔ ''مگر یہ دانے دانے پر مہر کا کیا مطلب؟'' سینور بارو نے پوچھا۔ حضور میں نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اناج کا ہر وہ دانہ جو ہم کھاتے ہیں، ہمارے نام اور پتہ کا حامل ہوتا ہے۔ ہم نہ اس سے زیادہ کھا سکتے ہیں نہ کم۔ مگر ہمیں تو کوئی مہر دکھائی نہیں دیتی'' چھوٹے مائستر و نے حیران ہو کر کہا۔ جناب اس کے لیے صوفی کا دل اور یوگی کی آنکھ چاہیے۔ (۴۸)

اشفاق احمد افسانہ ''بیا جاناں' میں یہ بیان کرتے ہیں کہ معاشرے میں بعض لوگ اپنے اوپر نیکی اور پارسائی کا خول چڑھا لیتے ہیں اور بعض لوگ محض اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پارسائی کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور لوگوں کے لیے فریب کا جال پھیلاتے ہیں۔ اس افسانے میں حنیف، سادھو اور گیانی ان تینوں کرداروں نے بھی ایک لڑکی کو متوجہ کرنے کی خاطر تصوف کا لبادہ اوڑھا اور جب لڑکی اس فانی دنیا سے کوچ کر گئی تو انہوں نے اپنا نام نہاد تصوف کے لبادے کو چاک کرنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> طالب مٹھ کے دروازے پر پہنچا۔ اندر سادھو، گیانی اور حنیف تپائی بیچ میں رکھے فلاش کھیل رہے تھے اور ان کے درمیان نئے نئے سکوں اور روپے روپے کے نوٹوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ ''آؤ آؤ'' سادھو نے خالص فلمی لہجے میں کہا۔ ''آجاؤ!'' ہو جائے ایک بازی کٹ تھروٹ، گیانی چلایا۔ حنیف طالب کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھا لیکن طالب دہلیز کے ساتھ ٹیک لگا کر پتھر کی مورتی بن گیا۔ اس نے پہلے سب کو ایک ایک کر کے دیکھا پھر چھت کی طرف نگاہیں دوڑائیں پھر گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا۔۔۔۔ مکان بھی وہی تھا۔ مکین بھی وہی تھے۔۔۔۔۔ جغرافیہ بھی وہی تھا۔۔۔۔ لیکن تماشا دیکھنے والی آنکھ باقی نہ رہی تھی! (۴۹)

اسی افسانے میں اشفاق احمد نے صوفیانہ رنگ کا پوری آب و تاب کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ صوفیانہ مباحث اور کیفیات کو انہوں نے یوں بیان کیا ہے کہ ان کیفیات سے گزرے بغیر ایسا بیان ممکن ہی نہیں مثلاً ''گیانی نے دیوار سے ٹیک

توڑ کر کہا۔ جب تک من اور تن میں چھینا جھپٹی رہے گی یہ بھید ہیر ہے گا۔ جب تک من کی کوک، فریاد نہ ہوگی یہ کواڑ بند رہیں گے۔''(۵۰)

اشفاق احمد کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ انہوں نے اپنے عہد کے دوسرے تصوف پسند افسانہ نگاروں مثلاً قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور بانو آپا جیسے ادیبوں سے ہٹ کر صوفیانہ تصورات اور مباحث کو منفرد انداز میں قاری کے سامنے لائے ہیں۔ اگر چہ تصوف کی روایت ان سے قبل کے نثر نگاروں نے احاطہ تحریر میں لایا تھا لیکن ان کا تصور، رویہ اور سوچ کا رنگ باقی نثر نگاروں سے ایک الگ رنگ میں موجود ہیں۔ افسانہ ''پل صراط اور پاسپورٹ'' میں صوفیانہ خیالات کا ذکر کچھ یوں ہیں:

> اپنے لیے تو سر ایمان چاہیے اور ایمان کی سلامتی چاہیے زبیر خان نے پورے یقین کے ساتھ کہا، جاتے ہوئے اور تو کسی چیز نے ساتھ جانا نہیں، بس ایک ایمان ہی ہوگا وہ بھی اگر ہوا تو!
>
> اسی ایمان نے بابے بڈھے کی انگلی پکڑ کر پل صراط سے گزارنا ہے، لیکن اگر ساتھ ہوا تو!(۵۱)

اس سارے بحث سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اشفاق احمد کے تحریر و تقریر سے تصوف کے اچھوتے موضوعات اور منفرد مباحث کی جھلک نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے ریڈیائی پروگراموں، ٹیلی ویژن کے پروگراموں، دوسرے غیر افسانوی نثری تحریروں اور خصوصاً افسانوں میں صوفی ازم کے مباحث کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

(د) اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کا امتزاج:۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کا امتزاجی رنگ ہے۔ اس امتزاج میں کہیں رومانیت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں تصوف کا۔ ان کے ہاں موضوع کی وسعت نہیں ہے لیکن جو کچھ انہوں نے تحریر کیا یا زندگی کے جس پہلو کو انہوں نے اپنا موضوع بنایا اس میں سوچ کی گہرائی ضرور ملتی ہے۔ افسانے کے فن پر اشفاق احمد کو قدرت حاصل ہے افسانہ خواہ کسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو اس میں سوکھا پن اور بوریت پیدا نہیں ہوتی اور زندگی کے بعض حقائق اس طرح روا روی میں آتے جاتے ہیں جیسے حالات کے تقاضوں سے خود بخود ابھر رہے ہوں۔

اشفاق احمد کا مشہور زمانہ افسانہ ''گڈریا'' میں محبت اور تصوف کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ اگر چہ اس افسانے کا بنیادی موضوع محبت ہے لیکن محبت کے ساتھ ساتھ تصوف کی امیزش پوری طرح عیاں ہے۔ اس افسانے میں محبت کسی خاص بندے سے نہیں بلکہ انسانیت سے محبت ہے۔ اس افسانے میں داؤ جی کا کردار اپنے اندر بہترین اور اعلیٰ انسانی اقدار کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ داؤ جی علم کو ایک لازوال دولت خیال کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے اپنے

اساتذہ کی عزت اور احترام کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> داؤ جی آپ کو اپنے استاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور اپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں۔؟۔۔۔۔۔۔۔داؤ جی نے مسکرا کر کہا، جو طویلے کے ''خر'' کو ایسا بنادے کہ لوگ کہیں کہ یہ منشی چنت رام ہے، یہ منشی جی ہیں وہ مسیحانہ ہو۔ آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟(۵۲)

اشفاق احمد کا تصوف کی پرخار وادی میں آنے کا مقصد دانش وحکمت کی تلاش ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک دانش دو قسم کی ہے۔ ایک دانش نورانی اور ایک دانش برہانی۔ دانش برہانی کا معاملہ تو سیدھا سادہ ہے، وہ اسلامی کتب اور علماء وفقہا کی محافظت میں ہے مگر دانش نورانی تک رسائی کے رستے بہت ادبر ہیں۔ اس دانش کو حاصل کرنے کے لیے کسی ولی یا کسی صوفی سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ صوفی اسے حکم دیتا ہے کہ فلاں بستی میں جا، وہاں علماء وفقہا کے استانوں سے ہٹ کر فلاں پیڑ تلے ایک بوڑھا موچی جوتیاں گانٹھتا ہے۔ تجھے جس دانش کی تلاش ہے وہ وہاں سے ملے گی۔ وہ ادھر چل پڑتا ہے۔ چنانچہ اشفاق احمد نے اس کی ایک جھلک افسانہ ''گڈریا'' میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

> انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے ''شکر کرو گار کنم کہ گرفتارم بہ معصیتے'' تھوڑی دیر رک کر پھر کہا ''تو اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سر مطہر پر کلے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی'' میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے ''آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ وشیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر۔ وہ اپنے محبوب کے طفیل نار جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیم مجھے جرات عطا کر، مولائے ایوب مجھے صبر کی نعمت دے۔(۵۳)

اشفاق احمد نے محبت اور تصوف کے امتزاج کو اپنے افسانوں میں واضح طور پر پیش کیا۔ لیکن اس کے لیے گہری سوچ اور غور فکر کی ضرورت ہے تب کہیں جا کر قاری کو احساس ہو جاتا ہے۔ انہوں نے محبت کے جادو سے دنیا کو مسخر کرنے، دہشت کی ماری دنیا، باطنی سکون سے محروم ہو کر عالم تنہائی میں چپکے چپکے آنسو بہانے والی دنیا کو از سر نو دریافت کرنے کا بھید تصوف میں پایا۔ افسانہ ''گڈریا'' میں محبت وتصوف دو اہم عناصر ایک دوسرے کے بالکل مساوی رہ کر کندھے سے کندھا ملا کر ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ ''رکی ہوئی عمر'' میں حقیقی محبت کا تصور اور صوفیانہ خیالات کی جھلک نظر آتی ہے۔ حضرت شاہ جو غلام علی کے پیر تھے۔ ان کا اکلوتا صاحبزادہ وفات پا گیا۔ غلام علی نے ولایت سے افسانہ نگار کو تعزیت کرنے کی تلقین کی اور ڈیرے پر جا کر حاضر ہونے کے لیے کہا۔ ڈیرہ بڑی مشکل اور دشوار گزار جگہ پر واقع تھا۔ مشکل اس لیے کہ وہاں جانا ناممکن سے قدرے آسان تھا۔ اشفاق احمد لکھتے

ہیں:

حضرت صاحب کا ڈیرہ کچھ بہت دور نہ تھا مشکل سے دو مربعوں کی واٹ ہوگی، پر راستہ بہت کھڑ بڑا تھا۔ ساری راہ کھالاں پٹتا اور ٹبوں پر ڈگتا ڈھیتا اور تھاں تھاں چکڑ سے تلکتا گیا اور سوچتا گیا کہ پتہ نہیں یہ لوگ اپنے ڈیرے ایسی تھاؤں پر کیوں بناتے ہیں جدھر کوئی اپڑھی نہ سکے۔(۵۴)

اشفاق احمد نے اس افسانے میں یہ بتانے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ اللہ والے ہمیشہ دنیا سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی دور پہاڑی یا ویرانے میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں یکسوئی سے دن رات مشغول رہتے ہیں اور آخرت کے لیے توشہ تیار کرتے ہیں۔

اشفاق کا افسانہ ''فہیم'' بھی محبت اور تصوف پر مبنی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں جگہ جگہ محبت اور تصوف کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ محبت کا منظر کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

بارش ذرا تھمی تو ژوں ژوں کرتی ہوا کی تیزی میں اضافہ ہوگیا۔ پروین نے لحاف سرکا کر نانی اماں کی طرف دیکھا جو چوکی پر بیٹھی ہونٹوں کو جلدی جلدی جنبش دیے جا رہی تھیں۔ ان کی یخ بستہ اور مڑی ہوئی انگلیاں تسبیح کے دانوں سے کھیل رہی تھیں۔ ایک دانے پر دوسرا دانہ ایسے گرتا جیسے آنسو کے بعد آنسو۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر سفیدی کی ایک تہہ چڑھ چکی تھی اور وہ بوڑھے مینڈکوں کی طرح ہانپ رہے تھے۔ بلب کے گرد چکر لگانے والا ایک بڑا سا پتنگا بار بار شیڈ ٹکراتا اور ہلکا سا ارتعاش پیدا کر دیتا۔ کبھی ہوا اپنا رخ بدلتی تو بارش کی نوجوان اور سڈول بوندیں باغ میں کھلنے والے دریچوں کے شیشوں پر چھن چھن شن شن جھنیاں بجانا شروع کر دیتیں۔(۵۵)

اسی طرح اشفاق احمد نے اس افسانے میں رومان اور محبت کے ساتھ ساتھ تصوف کو بھی بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں فہیم کے نانا درویش کی خدمت گزاری کے لیے نوکری چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک جگہ نانا کے بارے میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

کاملوں کی کراماتیں بھلا چھپ سکتی ہیں۔؟ تم تو پگلی ہو۔۔۔ بجائے خوش ہونے کے خفا ہوتی ہو۔ وہاں جا کر آخرت کا توشہ مہیا کروں گا۔ درویش کی خدمت گزاری اس ملازمت سے بدرجہا اچھی ہے۔ سرکار کی نوکری کا جل کی کوٹھڑی ہے اور اس میں دھبہ لگنے کا ڈر لگا ہی رہتا ہے۔۔۔۔ میں اس خبر لانے والے، استعفیٰ منظور کرنے والے اور تمہارے نانا کو کوستی وہاں

سے چل دی کہ پاک پروردگار ان سب پر میرا صبر پڑے۔۔(۵۶)

اشفاق احمد کے افسانوں میں تصورِ محبت کے حوالے سے ایک گوشہ ان کا بابوں کے کشف و کرامات اور ان سے محبت کا تصور ہے، بابوں سے محبت کا اظہار ان کے وصیت سے صاف ظاہر ہے۔ اشفاق احمد وصیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میری آرزو جس میں غالباً وصیت کا روپ اختیار کرنے کی خواہش بھی ہے اور بار بار میرے ذہن اور دل کی کروٹیں لیتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں بھی میری قبر ہو وہاں لوگوں کو راہ گیر کو پینے کا ٹھنڈا پانی میسر ہو یا کوئی ہنڈ پمپ وغیرہ ہی لگا ہو اور وہاں کابلی چنے والے چاولوں کی دیگ پکی ہوتا کہ بھوکے پیاسے لوگ کھا پی کر جائیں، جیسے مزاروں وغیرہ پر ہوتا ہے ، بابوں کے مزاروں کی طرح لیکن ایک بات کا خیال رکھا جائے کہ دیگ نئی اور اعلیٰ قسم کی نہ ہو بلکہ پرانی سی ہو اور چاول بھی سستے اور موٹے ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے بعد خلا محسوس کریں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ لوگوں کو پتہ ہو کہ یہ اشفاق احمد کی قبر ہے۔ بس یہ ہو کہ یہ کسی بابے کی قبر ہے۔ سایہ دار درخت ہوں جن پر مئی جون میں کوئل بولا کرے۔ میری خواہش ہے کہ یہ جگہ ایک کلب کی سی ہو چھاؤں میں لوگ آ کر بیٹھیں۔ زیادہ عیاشی کرنی ہو تو مہینے بعد ٹوٹا ہوا باجا اور پھٹی ہوئی ڈھولکی لے کر قوالی وغیرہ کرا دی جائے یعنی رونق میلا بنا دی جائے۔(۵۷)

اشفاق احمد چونکہ تصوف پسند افسانہ نگار ہیں۔ یہ تصوف محض تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ ان کے تجربات اور مشاہدات کا حصہ ہے اس لیے وہ ''بابوں'' کے کشف و کرامات کے قائل ہیں۔ وہ خود بھی بابوں کے پاس جایا کرتے تھے اور فضل خداوندی اور بن مانگے ملنے کے قائل تھے۔ وہ محبت کو روحانی طاقت کے طور پر بیان کرنے والے افسانہ نگار تھے۔ اسی محبت کی انہوں نے ترویج و اشاعت کی اور یہی محبت جب ارتقاء، پا لیتی ہے تو انسان صوفی بن جاتا ہے

اشفاق احمد بابوں کے کشف و کرامات کے قائل تھے اور وہ ہمیشہ بابوں کی تلاش میں رہتے تھے کیونکہ وہ بابوں کے عقیدت مند تھے۔ انہوں نے افسانہ ''گڈریا'' کے کردار ''داؤ جی'' میں ایسی خصوصیات اور خوبیاں دیکھی تھیں جو کہ ایک بابے میں ہونی چاہیے۔ بابوں سے عقیدت، محبت اور ان کی تلاش کے بارے میں انتظار حسین نے اشفاق احمد کے بارے میں لکھا ہے:

اشفاق احمد کے یہاں جو بابے کی تلاش کا جو چکر چلا ہوا تھا۔ وہ کیا تھا۔ مجھے تو اس تلاش و جستجو کے رشتے گڈریا سے ملتے نظر آتے ہیں۔ اور یہیں سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ اشفاق احمد اصل میں دو ہیں۔ ایک اشفاق احمد وہ تھا جس نے افسانے لکھے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پھر ایک اور ہی اشفاق احمد نے الیکٹرونک میڈیا میں آ کر اپنے جوہر دکھائے۔ مگر پتہ چلا ہے وہ پہلا اشفاق احمد پیچھے ہٹ گیا تھا، پسپا نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی رنگ میں اپنی موجودگی کا پتہ دیتا رہتا ہے۔ بابے کی تلاش اسی پہلے اشفاق احمد کا مقدر ہے۔ (۵۸)

اشفاق احمد صاحب حال بزرگوں کو ڈھونڈنے میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ اگر انہیں کسی صاحب معرفت شخص کے بارے میں علم ہوتا تو دور دراز علاقوں اور پسماندہ گاؤں تک اس سے ملنے کے لیے کوتاہی نہ کرتے۔ سلیم اختر ایک جگہ لکھتے ہیں:

یاروں کی محفل میں بعض اوقات اس پر بحث ہوئی کہ کیا واقعی بابوں کا وجود ہے۔؟ بعض اسے تسلیم نہ کرتے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے قطرہ قطرہ جو علم حاصل کیا اس نے اس کی شخصیت میں رنگ آمیزی یوں کی کہ وہ خود ہی لوک دانش کی علامت بن گئے۔ یعنی ''بابا۔ (۵۹)

اشفاق احمد کے افسانے ''دم بخود'' میں سورۃ الفاتحہ اور دعا مانگنے والے کے تیقن کی بات بیان کی ہے کہ جب شفاء اللہ تعالیٰ کی مرضی سے آتی ہے تو اس میں مانگنے والے کی رضا شامل ہوتی ہے اور دعا ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے ارادوں کو بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ گائتری روزانہ مسجد کے باہر شیشی لے کر کھڑی ہو جاتی تا کہ نمازیوں سے دم کروائے۔ یہ ایک ہندو لڑکی تھی لیکن اس کا سورۃ الفاتحہ پر یقین تھا جس کی وجہ سے اس کا چھوٹا بھائی مادھو شفایاب ہو سکا۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

بات یہ ہے، ماتھر جی نے ہماری جھولی میں کھچی پھیرتے ہوئے کہا، یہ سب بھگوان کے بھید ہیں اور اصل علم اسی کے پاس ہے پر جب کوئی اس کی چوکھٹ پر گھٹنے ٹیک کے اور سیس نوا کے اپنا آپ ۔۔۔۔ پورے کا پورا ۔۔۔۔ اس کے حوالے کر دیتا ہے تو وہ اپنی مرضی بھی تبدیل کر لیتا ہے۔ ہم سے تو یہ کام نہ ہو سکا۔ نہ مجھ سے نہ اس کی ماں سے، پر گائتری بنتی کر کر کے بھگوان کی اچھیا بدلوالی۔ (۶۰)

اشفاق احمد نے معاشرے میں بسنے والے لوگوں کے لیے بابوں کی نشانیاں بھی بتائی ہیں۔ اور بابوں کی تعریفیں بھی بیان کی ہیں کہ ایک بابے میں کون کونسی نشانیاں ہونی چاہیے اور بابے کیا ہوتے ہیں۔؟ اشفاق احمد نے

بابوں کے بارے میں پروگرام زاویہ میں بتایا ہیں:

> بابا وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے انسان کو آسانی عطا کرے۔ یہ اس کی تعریف ہے آپ کے ذہن میں یہ آتا ہوگا کہ بابا ایک بھاری فقیر ہے۔ اس نے سبز رنگ کا کرتا پہنا ہوا ہے۔ گلے میں منکوں کی مالا ہے، ہاتھ میں اس کے لوگوں کو سزا دینے کا تازیانہ پکڑا ہوا ہے اور آنکھوں میں سرخ رنگ کا سرمہ ڈالا ہوا ہے۔ (۶۱)

اشفاق احمد کے ہاں بابے کی نشانیاں انسانی سوچ سے ہٹ کر ہیں۔ بابے ہونے کے لیے فقیری، درویشی وغیرہ کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے لیے مرد کا ہونا لازمی ہے بلکہ بابے کی فہرست میں وہ سب مرد، عورت یا بچے شامل ہیں جو لوگوں کو آسانیاں عطا کرنے کا فن احسن طریقے سے جانتے ہیں مثلاً

> اس میں جنس کی بھی قید نہیں ہے۔ مرد، عورت، بچہ، بوڑھا، ادھیڑ، نوجوان یہ سب لوگ کبھی نہ کبھی اپنے وقت میں بابے ہوتے ہیں اور ہوگزرتے ہیں۔ لحاتی طور پر ایک دفعہ کچھ اسانی عطا کرنے کا کام کیا اور کچھ مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں اس شیوے کو۔ اور ہم ان کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ میری زندگی میں بابے آئے ہیں اور میں حیران ہوتا تھا کہ یہ لوگوں کو آسانی عطا کرنے کا فن کس خوبی سے کس سلیقے سے جانتے ہیں۔ (۶۲)

اشفاق احمد کے ہاں بابوں میں اپنی طرف راغب کرنے کا جو فن ہے وہ یہ کہ بابے سیدھے راستے صراط مستقیم پر چلے آرہے ہیں۔ بابے پکار کر کہتے ہیں، اھد نا الصر اط المستقیم ، تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ ہے، تو بابے کہتے ہیں کہ بسم اللہ ہم اس پر چلیں گے یعنی اشفاق احمد کے بابے اللہ تعالیٰ سے سیدھی راہ کی دعا مانگتے ہیں اور اس راستے پر ہمیشہ کے لیے چلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائی ہے۔

اشفاق احمد نے افسانے ''خود بدولت'' میں بابے کا ذکر کیا ہے جو خدا ترس بندہ ہے اور لوگوں کو اچھائی کی تلقین کرتا ہے۔ اس بابے کا نام انہوں نے ایک کردار ''بابے گاموں'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ اسی افسانے میں ایک کردار ''قارون'' کے نام سے ہیں جو کہ متکبر آدمی ہے، مالدار آدمی ہے۔ اشفاق احمد نے ''بابے گاموں'' کے ذریعے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو تکبر اور گھمنڈ سے بچنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے۔ دوسرے انسانوں کے ساتھ بھلائی و احسان کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> پھر بابے گاموں نے اونچی آواز میں کہا، میری بات کان کھول کر سن لے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی بندوں کے ساتھ احسان کر اور اس دنیا میں اپنی دولت کے زور پر فساد نہ پھیلا۔ میرا سوہنا اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (۶۳)

حوالہ جات

(۱) علی عباس جلالپوری، خرد نامہ جلالپوری، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۹۲

(۲) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۳۷

(۳) شاذیہ افتخار خان، اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز، لاہور، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۴۷۴

(۴) محبوب عالم، مولوی، اسلامی انسائیکلو پیڈ یا، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۶۹

(۵) عبدالکریم، ابوالقاسم، امام، تصوف کا انسائیکلو پیڈیا، (مترجم): محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر، مکتبہ رحمانیہ لاہور، س ن، ص ۲۱۶

(۶) محمد حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر، تصوف اور صوفیاء کی تاریخ، سیونتھ سکائی پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳

(۷) نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۳۰۵

(۸) محمد حفیظ الرحمٰن، ڈاکٹر، تصوف اور صوفیاء کی تاریخ، ص ۱۷۳

(۹) انتظار حسین، ''اشفاق احمد''، مشمولہ: ''دنیازاد'' (ترتیب وتالیف): آصف فرخی، اکتوبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۶۲

(۱۰) محمد عالم خان، ڈاکٹر، اردو افسانے میں رومانوی رجحانات، علم وعرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۴۷۸

(۱۱) غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، پاکستانی ادب، شناخت کی نصف صدی، ریز پبلیکشنز، راولپنڈی، اگست ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۹

(۱۲) لالہ رخ خان، ایک محبت سو افسانے کا تنقیدی جائزہ، منظور شدہ مقالہ برائے ایم اے اردو یونیورسٹی آف پشاور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۵

(۱۳) نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء، ص ۳۸۲

(۱۴) غلام حسین اظہر، ''اردو افسانہ پاکستان میں''، مشمولہ: ''اوراق'' افسانہ انشائیہ نمبر، مدیر: وزیر آغا، جدید ناشرین چوک اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۴۴

(۱۵) خالد حسین، ''اشفاق احمد، چند یادیں''، مشمولہ: ''پوسٹ کارڈ واشنگٹن'' خبریں، (روزنامہ)، لاہور، ۱۵ دسمبر ۲۰۰۴ء

(۱۶)جمیل الدین عالی، ''اشفاق احمد کی وفات ادب کے لیے ایک سانحہ ہے''، مشمولہ: جنگ (روزنامہ)، لاہور، ۸ستمبر۲۰۰۴ء

(۱۷)وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تك، الوقار پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۹۱

(۱۸)وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تك، ص۳۸۲

(۱۹)انور سدید، ڈاکٹر، اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۳۹

(۲۰)اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، فہیم، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۲۱

(۲۱)اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، رات بیت رہی ہے، ص۳۵

(۲۲)اشفاق احمد، ایك محبت سو افسانے، بابا، ص۱۳۵

(۲۳)ممتاز مفتی، اور او کھے لوگ، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۲۱

(۲۴)انتظار حسین، ملاقاتیں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۵۰

(۲۵)انور احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ تحقیق و تنقید، بیکن ہاوس گل گشت ملتان ۱۹۸۸ء، ص۴۸۲

(۲۶)ماہنامہ ''ٹی وی ٹیمپو'' کراچی، جولائی ۱۹۸۶ء، ص۲۵

(۲۷)اشفاق احمد، صبحانے فسانے، خود بدولت، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۵۲

(۲۸)نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقا''، مشمولہ: ''بازیافت''، شمارہ ۱۱۔ مدیر: محمد کامران، جولائی ۲۰۰۷ء، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص۱۸۲

(۲۹)گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۵۲۸

(۳۰)نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقا''، مشمولہ: ''بازیافت''، ص۱۸۹

(۳۱)ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص۲۶۹

(۳۲)بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مراجعت، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۲۱۷

(۳۳)نجیبہ عارف، ڈاکٹر، ''اردو نثر کے متصوفانہ رجحانات کا ارتقا''، مشمولہ: ''بازیافت''، ص۱۹۶

(۳۴)امجد طفیل، قرۃ العین حیدر، تشخص کی تلاش میں، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساونڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۴۳

(۳۵)اشفاق احمد، عرض مصنف، سنگ میل پبلی کشنز، لاہو، ر۲۰۰۶ء، ص۱۲

(۳۶)اشفاق احمد، عرض مصنف، ص۱۳

(۳۷)غالب احمد،''اشفاق احمد کے مختلف زمانے اور افسانے''،مشمولہ:''راوی''(اشفاق احمد نمبر)،جلد۹۲،واحد شمارہ،مدیر:ریاض الحسن،اکتوبر۲۰۰۵ء،شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور،ص ۴۸

(۳۸)محمد اکرم چغتائی،''اشفاق احمد اور السنہ عربیہ''،مشمولہ:''راوی''(اشفاق احمد نمبر)،ص ۳۰

(۳۹)بانو قدسیہ،''اشفاق احمد صاحب''مشمولہ:''راوی''(اشفاق احمد نمبر)،،ص ۱۲

(۴۰)اشفاق احمد،داستان سرائے کا مسافر،سنگ میل پبلی کشنز،لاہو،۲۰۰۵ء،۳۶

(۴۱)اشفاق احمد،من چلے کا سودا،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۵ء،ص ۲۶۲

(۴۲)طارق اسماعیل ساگر،''باتیں ان کی یاد رہیں گی''،مشمولہ:''ادب لطیف''(اشفاق نمبر)،مدیر:صدیقہ بیگم،مکتبہ جدید پریس لاہور،۲۰۰۵،ص ۳۷۰

(۴۳)اشفاق احمد،شاہلا کوٹ۔تلقین شاہ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۱ء،ص ۲۷۸

(۴۴)اشفاق احمد۔''حیرت کدہ''سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۱۹۹۵ء،ص ۵۸

(۴۵)عطاء الحق قاسمی،بلبل ہزار داستان''،مشمولہ:''ادب لطیف''(اشفاق نمبر)،ص ۴۰۰

(۴۶)نیاز خان،اشفاق احمد کی افسانہ نگاری،منظور شدہ مقالہ برائے ایم فل(اردو)جامعہ پشاور ،۲۰۰۸ء،ص ۲۷

(۴۷)سجاد باقر رضوی،''جریدہ ادب وثقافت''مشمولہ:''جنگ''لاہور،۵ اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۴۸)اشفاق احمد،گڈریا(اجلے پھول)،ایل ویرا،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،،ص ۱۴۹

(۴۹)اشفاق احمد،سفر مینا،بیا جاناں،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷ء ،ص ۲۱۲

(۵۰)اشفاق احمد،سفر مینا،بیا جاناں،ص ۲۰۲

(۵۱)اشفاق احمد،صبحانے فسانے،پل صراط اور پاسپورٹ،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،،ص ۲۱۲

(۵۲)اشفاق احمد،گڈریا(اجلے پھول)،گڈریا،ص ۲۷

(۵۳)اشفاق احمد،گڈریا(اجلے پھول)،گڈریا،ص ۲۶

(۵۴)اشفاق احمد،ایک ہی بولی(پھلکاری)،رکی ہوئی عمر،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۷ء،ص ۱۰

(۵۵)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے،فہیم،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۳ء،ص ۱۷

(۵۶)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے،فہیم،ص ۱۹

(۵۷)اشفاق احمد،''ایک وصیت''،مشمولہ:پاکستان(ہفت روزہ تصویر پاکستان)،۲۸ اگست ۱۹۹۲ء،ص ۱۰

(۵۸)انتظار حسین، ''صوفی، ملا اور اشفاق احمد''، مشمولہ: ''راوی'' (اشفاق احمد نمبر)، جلد۹۲، واحد شمارہ، ص ۴۷

(۵۹)سلیم اختر، ڈاکٹر، ''داستان سرائے کا داستان گو''، مشمولہ: ''راوی'' (اشفاق احمد نمبر)، جلد۹۲، واحد شمارہ، ص ۱۷

(۶۰)اشفاق احمد، صبحانے فسانے، دم بخود، ص ۲۶۲

(۶۱)اشفاق احمد، زاویہ (حصہ اول)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، مارچ ۲۰۰۴ء، ص ۵۵

(۶۲)اشفاق احمد، زاویہ (حصہ اول)، ص ۵۵

(۶۳)اشفاق احمد، صبحانے فسانے، خود بدولت، ص ۵۲

باب چہارم

اشفاق احمد کے افسانوں میں سماج اور محبت

(۱) اشفاق احمد کے افسانوں میں سماج اور محبت کا باہمی تعلق:۔

سماج انسانوں کے اجتماع کا نام ہے۔ابتدائے افرنیشن سے محبت اور معاشرے کا بندھن مضبوط رہا ہے ،تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر دکھائی دیتی ہے کہ ہر سماج میں محبت کے متنوع رنگ موجود تھے اور کسی بھی معاشرے نے محبت کا بندھن ٹوٹنے نہیں دیا۔ ہر ایک سماج میں میاں بیوی کی محبت ،والدین کا اپنے بچوں سے پیار،قوم،ملک اور مٹی سے الفت ،رشتہ داروں اور بزرگوں سے محبت ،مذہب ،روایات اور تہذیب وثقافت سے محبت وغیرہ، یہ سب معاشرے اور محبت کے باہمی رشتے کا ثبوت ہے۔

سماج اور محبت کا آپس میں گہرا رشتہ اور تعلق ہے۔محبت کو معاشرے سے اور سماج کو محبت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔جب سے بنی نوع انسان نے اس دنیا میں گروہی واجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہے اس نے محبت کو سماج میں اولیت بخشی ہیں۔سماج اور محبت کے تعلق کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ یہ وضاحت کی جائے کہ سماج کیا ہے؟ سماج کا مفہوم کیا ہے؟ مختلف ماہرین نے سماج کی تعریف کن الفاظ میں بیان کی ہیں؟ معاشرہ کی تعریف اور مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر شعیب عتیق لکھتے ہیں:

> معاشرہ کے لفظی معنی آپس میں مل جل کر زندگانی کرنا ،اوقات بسری کرنا ،کسی کے ہمراہ عیش کرنا ہیں ،عربی زبان کے اس لفظ کا مادہ عشر ہے۔اپنے لفظی مفہوم میں جتنا یہ لفظ سادہ ہے ،اصطلاحی مفہوم میں اتنا ہی پیچیدہ ہے۔یہ اس دور کی بات ہے جب انسان ابھی اصطلاحات کی پیچیدگیوں میں نہیں پڑا تھا کہ معاشرہ کے لفظی اور اصطلاحی معنوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔آج معاشریات ایک وسیع علم ہی نہیں تمام عمرانی علوم کا سرچشمہ ہے۔(۱)

سماجی علوم سے وابستہ دوسری اصطلاحات کی طرح لفظ ''سماج'' کی بھی کوئی ایسی تعریف مشکل ہے جس پر تمام عمرانیات کے ماہرین متفق ہوں۔تاہم ایسے عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جس پر زیادہ تر ماہرین کا اتفاق پایا جاتا ہے۔اپنے وسیع تر مفہوم میں ''سماج'' انسانوں کے ایک ایسے گروہ پر محیط ہے جو کسی حد تک منظم زندگی بسر کرتے ہوں۔جن کی زندگی کے کچھ مشترک اصول ہیں۔

سماج یا معاشرہ کا متبادل انگریزی لفظ سوسائٹی (Society) محدود اور وسیع دونوں مفہوم رکھتا ہے۔اپنے محدود مفہوم میں لفظ سوسائٹی ،ایسوسی ایشن (Association) یعنی بعض مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے شعوری طور پر قائم کی گئی کسی تنظیم کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ وسیع مفہوم میں اس کے پیش نظر زندگی کی ان گنت ضروریات کی تکمیل ہے۔عمرانیات میں یہ فقرہ اب بغیر کسی حوالے کے ابدی صداقت کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہ ''انسان مدنی الطبع ہے۔'' اور انسان کی یہ جبلت ارتقاء پذیر ہے۔انسان نے جانوروں کی طرح اپنی مجلسی زندگی کا اغاز وابتداء

انتہائی سادہ طریقے پر کیا تھا۔آج زندگی کی جو شکل نظر آتی ہے،وہ انسان کے معاشرتی عمل کے مسلسل ارتقاء کا نتیجہ ہے۔سماج یا معاشرہ کی تعریف کشاف تنقیدی اصطلاحات میں ان الفاظ میں لکھی گئی ہیں:

> سماجی تعلقات کا وہ نظام جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گزارتے ہیں معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے سماجی تعلقات کا یہ نظام با الفاظ دیگر ہمارا سماجی ماحول، ہمارے اوہام وعقائد، افکار وتصورات ، ہمارے فلسفہ حیات اور ہمارے کردار کی تشکیل وتعمیر میں بہت حد تک دخیل ہوتا ہے۔معاشرہ کا لفظ ادبی تحریروں میں سماجی تعلقات کے نظام کے علاوہ کبھی پوری انسانی برادری کے لیے، کبھی ایک قوم کے لیے اور کبھی چند خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔(۲)

معاشرہ انسانوں کے باہمی مل جل کر رہنے کو کہتے ہیں جیسا کہ مختصر اردو لغت میں لکھا گیا ہے ''معاشرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی'' آپس میں مل جل کر رہنا یا اکھٹے زندگی بسر کرنا کے ہیں''(۳)

انسانوں کا باہمی مل جل کر زندگی گزارنے کا نام معاشرہ یا سماج کہلاتا ہے کیونکہ انسان کو اپنی ضروریات زندگی کے لیے دوسرے افراد سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔اردو انسائیکلو پیڈیا میں معاشرہ کی تعریف یوں لکھا گیا ہے:

> معاشرہ (Society) کثیر التعداد بنی نوع انسان کی وہ جماعتی زندگی جس میں ہر فرد کو رہنے سہنے اور اپنے ترقی ،حصول مقصد اور فلاح وبقا کے لیے دوسرں سے سابقہ پڑتا ہے اور جس ماحول سے کسی فرد بشر کو مفر نہیں معاشرہ کہلاتا ہے اس میں ہر فرد واحد اپنی اپنی جگہ اسی گروہ، جماعت یا معاشرہ کا جزو اور حصہ ہوتا ہے، کیونکہ اسے اپنی ضروریات زندگی کے لیے دوسرے لوگوں یعنی معاشرہ سے وابستہ رہنا پڑتا ہے۔(۴)

معاشرہ کا اصطلاحی معنی لوگوں کا وہ گروہ ہوتا ہے جو کسی مشترکہ نصب العین کی خاطر وجود میں آیا ہو۔کیمبرج ڈکشنری آف سوشیالوجی میں معاشرہ کی وضاحت اس طرح سے کی گئی ہے کہ:

> "Humain beings are social animals and organize their activities in groups.The term "Society" is used to describe a level of organization of group that is relatively self-contained."(5)

اس طرح بلیک ویل ڈکشنری میں سماج یا معاشرہ کی تعریف کچھ یوں لکھا گیا ہے:

"Society :Probalbly the most frequent use of word today is in reference to the totality of human beings on earth together with their culture,institutions,skills,ideas and values."(6)

اس طرح اردو اور انگریزی کے مختلف لغات میں سماج کی تعریف اور مفہوم درج ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری آف سوشیالوجی کے مطابق معاشرہ کی تعریف یہ ہیں:

"Society generally a group of people who share a common culture occupy a particular territorial area and feel themselves to constitute a unified and distinctenity "(7)

قدیم معاشرہ فرد پر غالب تھا اور فرد معاشرے کے قوانین سے سرتابی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا ۔ چنانچہ قدیم معاشرتی ڈھانچے میں فرد کی حیثیت ٹائپ (Type) کے متماثل تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا قدیم سماج میں فرد اور معاشرے کے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> معاشرے کے چھتے میں فرد کی حیثیت شہد کی مکھی کے مانند تھی اور اس کی بقا اور سالمیت چھتے کے دم قدم سے قائم تھی اس سے الگ ہو کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ گویا فرد معاشرے کے کل میں مکمل طور پر جذب تھا اور معاشرے کے اجتماعی مفادات کی تکمیل اور نگہبانی میں کارکن مکھیوں کی طرح ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ دوسری خاص بات یہ کہ قدیم معاشرہ ''ماضی'' اور ''حال'' کے صیغوں کی قید و بند سے آزاد تھا۔ وہ فقط ''حال'' کے لمحہ رواں میں مقید تھا کیونکہ قدیم انسانی معاشرہ ''حیوانی زندگی'' (Animal Kingdom) کی ارتقاء پائی ہوئی ایک شکل تھا۔ لہذا وہ بھی جانوروں کی طرح ماضی اور مستقبل سے بے نیاز فقط ''حال'' کے لمحے جی رہا تھا۔(۸)

انسان کو جب سماجی حیوان (Social Animal) سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس سے ذہن میں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے حیوانی گروہ بندی سے باہر آ کر اور ایک بڑے پیمانے پر معاشرتی گروہ بندی کو وجود میں لا کر دیگر تمام مخلوقات پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ پھر بھی سماجی حیوان سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ فرد ایک ایسا سماجی حیوان ہے جو معاشرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا یا یہ کہ وہ اپنی پہچان قائم نہیں رکھ سکتا۔ فرد اور سماج کا رشتہ کل اور جزو

کی طرح ہے جس کے بارے میں سلیم آغا قزلباش لکھتے ہیں:

> فرد اور معاشرے کے تعلق کو جزو اور کل کے حوالے سے بھی واضح کرنے کی کوشش کی گئی مگر فی الحقیقت فرد اور معاشرے کے سلسلے میں دو نقطہ ہائے نظر ہمیشہ توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اول یہ کہ معاشرہ ''کل'' ہے اور فرد ''جزو'' اور فرد کی بہتری اور سالمیت اسی امر میں پوشیدہ ہے کہ وہ ''کل'' کے زیر سایہ زندگی بسر کرے۔ مزید برآں فرد محض مشین کا ایک پرزہ ہے اور اس کی الگ حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوم یہ کہ فرد طبعاً آزاد فطرت ہے اور وہ طویل مدت تک پابندیوں میں رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ سو معاشرے سے روگردانی یا بغاوت کرنا اس کے کردار کی بنیادی خاصیت ہے پھر یہ کہ معاشرہ تو ایک دکھاوے کی چیز ہے۔ اصل حقیقت تو فرد ہے کہ جس کی عدم موجودگی میں معاشرے کا وجود خیال محض ہے۔(۹)

فرد اور سماج کے مابین صنوبر اور باغ کا سا رشتہ ہونا چاہیے یعنی فرد معاشرے کے قوانین وضوابط کا پابند بھی ہو اور اسے شخصی آزادی کے اظہار کے مواقع بھی فراہم ہوں لیکن جب سماج اپنے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے ذریعے فرد کو تحفظات مہیا کرنے کی بجائے اس کی سرکوبی کی طرف راغب ہو جائے تو لامحالہ فرد میں بغاوت کا عنصر پیدا ہو جائے گا۔

گویا افراد کے باہمی تعلقات کا سلسلہ سماج کہلاتا ہے۔ سماج افراد کا ایسا گروہ ہوتا ہے جو مشترکہ مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے باہمی اتحاد اور تعاون کے ساتھ منظم زندگی گزارتا ہے۔ معاشرہ انسان کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ انسان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی اور اس کی سیرت وکردار کی تعمیر بھی اسی معاشرہ کی مرہون منت ہے اور انسان اپنی باہمی تعلقات کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ تنہا زندگی گزارنا انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر رشید احمد اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> انسان بھی حیوانی ضروریات ۔۔۔ حفاظت نفس اور بقائے نسل ۔۔۔ کی خاطر اجتماع کا محتاج ہے بلکہ دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان دوسروں کا زیادہ دست نگر ہے کیونکہ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اتنی آسان نہیں جتنی دیگر جانوروں کی ہے۔(۱۰)

سماج اور محبت کا رشتہ نہایت مضبوط ہے۔ معاشرہ میں رہتے ہوئے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے گرد ہر جاندار کی زندگی گھوم رہی۔ یہ ایک ایسا احساس ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہ محض محسوس کیا جا سکتا ہے اس کی پیمائش نہیں کی جا سکتی کہ کون کس سے کتنا پیار ومحبت کرتا ہے۔ بہر حال سماج میں بسنے والے ہر جاندار چاہے وہ انسان ہو یا جانور محبت کے اس جذبہ کو محسوس کرتا ہے۔

انسان اور سماج کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی بھی فرد کے کردار اور شخصیت کی تعمیر میں معاشرہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح انسان مختلف صورتوں میں سماج پر اثر انداز ہوتا ہے جیسا کہ وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ہر فرد کی ذات کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک وہ جو سوسائٹی کی اقدار سے ہم آہنگ رہتا اور فرد کو ایک مثالی نمونے کی صورت سوسائٹی سے وابستہ رکھتا ہے۔ دوسرا وہ جو سوسائٹی کی اقدار سے بغاوت کرتا ہے ور فرد کو ایک کردار کے روپ میں پیش کرتا ہے۔ (۱۱)

انسان سماج میں رہتے ہوئے دو قسم کی زندگی گزارتا ہے کبھی انفرادی طور پر تو کبھی اجتماعی طور پر۔ جس کی وضاحت ڈاکٹر وزیر آغا نے ان الفاظ میں لکھی ہے:

> اصل چیز انسانی زندگی ہے جس کے دو واضح رخ ہیں۔ ایک رخ مزاجاً اجتماعی ہے اور دوسرا مزاجا انفرادی، جب اجتماعی رخ مسلط ہوتا ہے تو انفرادی رخ کے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں اور جب انفرادی رخ اپنی قوت کا اظہار کرتا ہے تو اجتماعی رخ میں دراڑیں آنے لگتی ہیں۔ (۱۲)

معاشرتی انتظام کی بقا انسانوں کے مل جل کر رہنے میں پوشیدہ ہے یہ فرد واحد کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح معاشرتی ترقی کے لیے سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت سماج میں ہم آہنگی کا ہونا ہے۔

کسی معاشرے کی ترقی سے مراد محض مادی وسائل کی فراوانی نہیں بلکہ اصل میں معاشرتی ترقی مادی خوراک کے پورا ہونے کے ساتھ ساتھ سماج کے مختلف گروہوں میں ہم آہنگی کا ہونا بھی ہے۔ کوئی بھی انسان تنہا زندگی نہیں گزار سکتا۔ انسان اور سماج لازم و ملزوم ہیں جیسا کہ شمیم حسین قادری لکھتے ہیں'' فرد اور معاشرہ باہم لازم ملزوم ہیں۔ معاشرہ افراد کے بغیر تشکیل نہیں پا سکتا اور فرد معاشرے سے کٹ کر ایک بے حقیقت اکائی رہ جاتا ہے۔'' (۱۳)

انسان اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اور اپنی بنیادی ضرورتیں مثلاً اپنی بقاء تولید، تناسل، حفاظت، رہائش، لباس، خوراک کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ہر قسم کا دکھ اٹھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ بعض اوقات اپنے آپ کو ایسے خطرات سے دوچار کر بیٹھتا ہے جو اس کی بقائے حیات کے منافی ہوتے ہیں لیکن وہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ سارے کام خوشی سے کر لیتا ہے لیکن تنہا زندگی گزارنا اس کے بس سے باہر ہے۔ جو انسان سماج سے الگ ہو کر زندگی گزار لیتا ہے اور خود کو دوسروں سے علیحدہ کر بیٹھتا ہے، دیوانگی کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر اس کی یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطری طور پر مل جل کر رہنے کی جبلت عطا کی ہے۔ سماج میں زندگی بسر کرنے والے افراد بظاہر ایک دوسرے سے الگ لیکن اصل میں جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ مل جل کر رہنے سے ہر فرد دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اہمیت بھی رکھتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص صرف اپنی بنائی ہوئی چیزوں سے فائدہ نہیں اٹھاتا یا اس کی بنائی ہوئی اشیاء صرف اسی کے لیے فائدہ مند نہیں ہوتیں۔ ہر فرد کے لیے

جسمانی اور ذہنی طور پر اپنا کردار ادا کرنا ضروری ہوتا ہے اور ہر کردار کے مختلف رول ہوتے ہیں جو اسے نبھانے پڑتے ہیں۔اسی لیے سماج ،مختلف افراد کے گروہ سے وجود میں آتا ہے۔معاشرہ فرد کے بغیر اور فرد معاشرے کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔فرد کی اسی اہمیت کے پیش نظر تجمل حسین ہاشمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ''ایک صحت مند معاشرہ کسی بھی فرد کو بے حقیقت نہیں سمجھتا۔اگر کسی معاشرہ کے افراد اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھتے ہیں تو یہ معاشرہ کے جمود اور اس کی کم مائیگی کی نشانی ہے۔''(۱۴)

سماج ہی تمام انسانوں کے مابین نشوونما کا ذریعہ ہے اور انسان کا وجود سماج کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے ۔پروفیسر خورشید اس موضوع کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> انسان ایک معاشرتی حیوان ہے یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں اجتماعی زندگی کا محتاج ہے ۔بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے ۔انسان اپنی ہر متعلقہ سے مثلاً خوراک ،لباس، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا دست نگر ہے اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔انسان کے اعمال ،اعراض وعادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی حقیقت نہیں ۔(۱۵)

سماج ہی انسان کو سنوارتا اور بگاڑتا ہے ۔اس کے اثرات انسانی زندگی بلکہ اس کی شخصیت وکردار کی تعمیر کرتے ہیں ۔سماج ہی افراد کی نشوونما کرتا ہے اس لیے انسان معاشرے سے بیگانہ نہیں رہ سکتا کیونکہ دوسری صورت میں وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے گا۔ڈاکٹر خالد علوی ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> انسان اپنی طبیعت ،اپنے ماحول ،اپنی خواہشات اور دیگر عوامل کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کے لیے مجبور ہوا۔اس سے مراد انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مربوط کوشش کرنا ہے تاکہ ذاتی تحفظ ،اظہار شخصیت اور ہمسائیگی کی تکمیل ہو سکے۔(۱۶)

سماج میں انسان کی اہمیت مسلم ہے اس کے برعکس جو لوگ معاشرے میں افراد کی اہمیت کو تسلیم نہیں کرتے یا افراد کی اہمیت سے آگاہ نہیں ہوتے وہ کم فہمی کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ فرد اور سماج لازم وملزوم ہیں اور افراد ہی سے سماج تشکیل پاتا ہے۔فرد کے کردار ،شخصیت اور ماحول سے نمو پانے والے سماج میں افراد کا چال چلن ہی معاشرے میں تغیر وتبدل کا باعث بنتا ہے۔تجمل حسین ہاشمی اس کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

> افراد کا کردار ہی چال چلن بن جاتا ہے۔معاشرے کی یہ روش اور زیادہ افراد کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور زیادہ سے زیادہ افراد کا کردار اسی سمت میں چلنا شروع ہو جاتا ہے جس سے اس روش کو

اورزیادہ تقویت ملتی ہے حتی کہ معاشرے کے بیشتر افراد اس رنگ میں رنگے جاتے ہیں۔اس کا مطلب ہوا کہ چند افراد کا کردار معاشرے کا چلن بن سکتا ہے اور ہزاروں، لاکھوں افراد کا کردار متاثر کرسکتا ہے۔(۱۷)

سماج جہاں انسان کو پستی کی گہرائیوں اور آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے، اسی طرح انسانوں کا چال چلن بھی معاشرے کو متاثر کرتا ہے اور سماج میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان کا اثر افراد اور ماحول دونوں پر پڑتا ہے اور نئے تغیرات سامنے آتے ہیں۔

سماج اور انسان کا آپس میں گہرا رشتہ ہے۔اس تعلق سے کوئی بھی ذی عقل انکار نہیں کرسکتا کیونکہ کوئی بھی فرد تنہا کسی بھی اچھے یا برے فعل کا ذمہ دار نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ میں رہتے ہوئے انسان اچھائی یا برائی کا مرتکب ہوسکتا ہے اس سلسلے میں تجمل حسین ہاشمی لکھتے ہیں کہ:

اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ معاشرہ فرد کے بغیر اور فرد معاشرہ کے بغیر کوئی وجود نہیں رکھتا ۔اس لیے بعض ماہرین معاشرہ کو ایک جسم اور فرد کو ایک عضو سے تشبیہ دیتے ہیں جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنا اپنا کام مخصوص طور پر کرنے کے باوجود باہمی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اور مل کر تمام کام سرانجام دیتے ہیں۔اسی طرح معاشرہ کے افراد اپنے اپنے کام اور باہمی تعلقات سے معاشرے کا نظام قائم رکھتے ہیں۔(۱۸)

اشفاق احمد کے افسانوں سے محبت کا سماجی اظہار بالکل واضح ہیں۔وہ ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں ہر طرف محبت ہی محبت نظر آتی ہو۔وہ فرسودہ روایات تمدن سے پاک معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں ہیں۔ان کے ہاں محبت کا سماجی اظہار محدود نہیں بلکہ بہت وسیع ہے وہ نہ صرف ایک خطہ زمین کے لوگوں کے رہن سہن کی بات کرتے ہیں بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر بلا تخصیص مذہب وملت انسان کی فلاح و بہبود کے لیے پیغام دیتے ہیں۔سماج میں انسان سے محبت کا جذبہ کائنات میں بلا امتیاز رنگ، نسل، نوع، مذہب، جنس کے دکھائی دیتا ہے ۔وہ انسانوں کے ساتھ ساتھ پھولوں، کلیوں، درختوں، گھاس پھونس، پرندوں اور جانوروں سے بھی محبت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اس دنیا میں سب انسان مل جل کر ایک دوسرے کی بھلائی اور خدمت پر مامور ہیں وہ ''دھرتی کے رشتے'' میں لکھتے ہیں کہ:

امیر اور کئی عزیز اور میرے بہت ہی قریبی عزیز ہیں، میرے صرف مسلمان، پارسی، شیعہ، سنی ، بابری، عیسائی، میگوار، گہری ہی عزیز واقارب ہیں بلکہ وہ جانور بھی میرے عزیز رشتہ میں یہ مینا ، اونٹ، فاختائیں، درخت، کیکر، شہتوت، طوطے بھی رشتہ دار ہیں۔(۱۹)

گویا اشفاق احمد کو معاشرے کی ہر چیز سے، ہر مسلک سے، ہر ایک مذہب سے محبت ہیں۔ وہ اسی وسیع معاشرے میں امن وامان اور محبت کی ایسی شمع منور کرنا چاہتے ہیں جس کی روشنی نہ صرف موجودہ نسل کے اذہان ،ارواح اور ابدان کو روشن کرے بلکہ آئندہ نسلوں پر بھی اپنے اجالے کی کرنیں منتقل کرے تا کہ وہ ایک زندہ اور روشن قوم بن سکیں۔

اشفاق احمد کے ہاں محبت کا جو جذبہ ہے وہ سماجی اور اجتماعی نوعیت کا ہے۔ اس میں انسانی اقدار کی پاسداری اور انسانیت سے محبت کے ساتھ ساتھ زندگی کی پیچیدگیوں کا بھی گہرا شعور ملتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں کہ:

> اشفاق احمد نے اس زندگی کے ایک اور رخ کو اپنایا۔۔۔۔جس میں سماجی حیثیت کی پیدا کردہ الجھنیں شامل ہیں اور ان الجھنوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں ،محرومیاں ،دکھ اور خوشیاں ان کے افسانوں کا موضوع ہیں۔(۲۰)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کا سماجی اظہار بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ محبت کے سماجی اظہار کے حوالے سے ان کا افسانہ ''تو تا کہانی'' ہے۔ اس افسانے میں محبت ایک ایسے جذبے کی صورت میں نمودار ہوتی ہے جسے کسی طرح دبایا نہیں جا سکتا۔ سماج، وقت، انسان ہر دور میں راستے میں رکاوٹیں حائل کرنے کی سعی نا تمام کرتے ہیں اور انسان وقتی طور پر ان سے ڈر بھی جاتا ہے اور اپنے دل میں خوف کا ایک طوطا پال لیتا ہے جو کہ اس کے اندر حالات کا خوف پیدا کرنے کی جدوجہد جاری رکھتا ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب انسان اپنے خود ساختہ پالے ہوئے طوطے کو قابو کر لیتا ہے اور اپنے گرد بنائی گئے حصار کو گرا کر محبت کی منزل کی طرف رواں ہوتا ہے:

> ہاں تم میری پڑوسی ہو اور میرے مکان کے گرد جو کوئی بھی رہتا ہے، وہ میرا پڑوسی ہے۔ پر میں تو اس طوطے کا ہمسایہ ہوں جو ہر رات تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کے لیے ایک کہانی سنایا کرتا ہے۔ اس کی ہر کہانی میرے گھر کے دروازوں میں ایک ایک میخ بن کر گڑی ہوئی ہے اور میرے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا ہے۔ تم ہر شام وہ میخیں اکھاڑنے آتی ہو، مگر ایک نئی ٹھونک کر چلی جاتی ہو۔(۲۱)

اس افسانے میں سماج کے اندر عورت اور مرد کی محبت کو ایک فطری عمل کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ عورت کے دل میں مرد کے لیے ایک جذبہ ضرور ہوتا ہے اور اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اس سے محبت کرے۔ اس افسانے میں ''حامد'' ''خجستہ'' کو یہی باور کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسے احساس دلاتا ہے کہ وہ شخص میں تھا جو کبھی دھیرے سے تمہیں خیالوں میں گدگدا دیتا تھا۔ سکول کی سیڑھیوں میں تم میرا انتظار کیا کرتی تھی۔ اس

افسانے میں حامد ''خجستہ'' سے کہتا ہے کہ:

> ہم جسے ظالم کہتے ہیں، وہ دراصل ہمارا اپنا پیار ہوتا ہے۔ ہم جسے مایوسی سمجھتے ہیں، وہ ہماری ابھرتی ہوئی آس کی زمردیں کلغی ہوتی ہے اور جسے تم بدمعاش کہتی ہو، وہ تمہارا محبوب ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کسی کی محبوبہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی تو تم یقیناً ایسا نہ کہتی لیکن رونا تو یہی ہے کہ تم بچپن سے لے کر اب تک محبت کرتی آئی ہو اور بڑھاپے میں بھی اپنے عاشقانہ جذبات گریز نہ کر سکو گی۔ پتہ نہیں اب تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو۔؟ (۲۲)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کے سماجی اظہار کے خوبصورت مرقعے پیش کئے ہیں اور محبت سے وابستہ معاشرے کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے افسانے ''شب خون'' میں دق کے مریضوں کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کو بیان کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ عام لوگوں کا سلوک اور رویہ کیسا ہوتا ہے اور وہ کیسا محسوس کرتے ہیں۔ گھر والے حاضر ہونے کے باوجود ان کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتے۔ سب کے ہوتے ہوئے وہ دنیا میں تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے پیارے انہیں ہسپتالوں میں مرنے کے لیے چھوڑ آتے ہیں۔ اس افسانے میں ''بیٹرس'' کا کردار اس معاشرے کی عکاسی کرتا ہے کہ اب کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو انسانیت سے محبت رکھتے ہیں۔ بیٹرس ہمیشہ کے لیے شقو کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ کیونکہ بیماری میں وہی تیمارداری کرتی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> بیٹرس کو عشق عباس ہی سے ہوا لیکن پیار سب سے زیادہ شقو پر آیا۔ اگر شقو صحت یاب ہو جائے ،اس نے سوچا تو کتنا اچھا ہو۔ میں اسے کبھی گھر واپس نہ جانے دوں۔ وہ لوگ تو نا امید ہو ہی چکے ہیں اور اب انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر ہوتی تو سالمی میں کئی بیڈ خالی تھے، کوئی ریزرو کر والیا ہوتا۔۔۔۔ شقو عمر بھر میرے پاس رہے۔ (۲۳)

اشفاق احمد نے محبت کے ایک ماہر نباض کی طرح سماج میں محبت کے متنوع رنگوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ ان کو معاشرے کے انسانوں کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود جانوروں سے بھی محبت اور پیار کا رویہ اختیار کیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ بے زبان بھی سماج کا حصہ ہے۔ یہ بھی پیار و محبت کے مستحق ہیں۔ ان کا افسانہ ''تلاش'' اسی محبت کا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بنیادی طور پر ایک جانور اور انسان کی محبت و انیست کی کہانی ہے۔ اس میں مرکزی کردار ایک چھوٹے بچے کو حاصل ہے جس کا نام ''احسان'' ہے جسے اپنے کتے سے بے حد پیار و محبت ہے۔ احسان معاشرے کے ہر اس فرد کو پسند کرتا ہے جس کسی کو اس کے کتے سے پیار ہوتا ہے اور جو اس کے کتے ''جیکی'' کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا احسان بھی اس کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتا۔ پورے سماج

میں ''جیکی'' اس کی ساری کائنات ہے۔ اس لیے احسان اپنی امی کی ہر قسم کی گالی گلوچ سہتا ہے لیکن پھر بھی وہ ''جیکی'' کو اپنے سے دور نہیں ہونے دیتا:

> امی باہر نکلیں تو گویا قیامت آ گئی۔ جیکی تو خیر دو تین چیخیں مار کر کوئلوں کی بوریوں کے پیچھے جا چھپا لیکن دوسرے سب کہاں چھپتے! وہ منہ بھر کے گالیاں دیں کہ سب اپنی جگہ بت بن گئے۔ ''کہاں گیا احسان کا بچہ؟ انہوں نے کڑک کر پوچھا۔
>
> ''منہ جھلس دوں تیرا، پاجی، بڑی سوغات اٹھا کے لایا تھا۔ اپنی اور کوئی چیز تو نہ لا سکے یہ طباقی اٹھا لایا۔ (۲۴)

اشفاق احمد کے ہاں جانور بھی سماج کا حصہ ہے اس لیے جانوروں سے بھی محبت کرنی چاہیے جس طرح انہوں نے احسان کے کردار کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے سماج کے اندر رہتے ہوئے محبت کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہے جو کہ ہر ایک رومانوی افسانہ نگار کی سوچ سے بالاتر ہے۔ انسان کا معاشرے کے ہر چیز سے فطری محبت ہوتی ہے لیکن اس کے برعکس جانوروں کا بھی انسانوں سے محبت کا جو تصور اشفاق احمد نے بیان کیا ہے اسی نے ان کو انفرادیت بخشی ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> مشرقی پنجاب میں اتنا سارا وقت ضائع کر دینے کا تریاق انہوں نے یہی سوچا کہ کراچی میں تعلیم کے اوقات بڑھا دیے جائیں۔ وہ سورج چھپے گھر واپس آتا۔ اس دوران میں جیکی لاکھ چیختا چلاتا، اپنی زنجیر دانتوں سے کاٹتا، پنجوں سے زمین کھرچتا لیکن کچھ بن نہ پڑتی۔ اس کے گلے میں پڑا ہوا چمڑے کا پٹہ زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔ (۲۵)

اشفاق احمد نفسیات کے ماہر افسانہ نگار ہیں ان کی نگاہ معاشرتی برائیوں پر عقاب کی طرح پڑتی ہے جیسا کہ ہر دور میں معاشرتی برائیاں متنوع رنگوں میں پائی جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے اخلاص، پیار، محبت اور ہمدردی جیسے اوصاف ناپید ہو جاتے ہیں۔ جس معاشرے میں برائیاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں تو ایسے معاشرے کو محبت کی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اشفاق احمد نے بھی سماج میں ان برائیوں کی نہ صرف نشان دہی کی ہیں بلکہ بحیثیت مسلمان ان برائیوں کی بیخ کنی کی کوششوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہیں۔

اشفاق احمد اپنے سماج کی بے حسی کی داستان رقم کرتے ہوئے اس میں پروان چڑھنے والی برائیوں کی بھی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی تناظر میں ان کا ایک افسانہ ''عجیب بادشاہ'' ہے جس میں جب ایک دوست چپکے سے اپنے دوست زمان کے بیٹے کی علاج کے لیے جیب میں چند روپے رکھ دیتا ہے تو اس کی جیب ہی کوئی کاٹ

لیتا ہے اور یوں اس کا بیٹا ہمیشہ کے لیے موت کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''یار! وہ بھی اپنی ممی سے جا ملا۔ پھر اس نے اپنے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دامن الٹ کر کہا ''یار ذرا دیکھنا۔ کل رات یہاں سے جاتے ہوئے کسی صاحبزادے نے ہماری جیب کاٹ لی۔ جیسے ہم جیبوں میں نوٹ ہی تو ڈالے پھرتے ہیں۔ سالے کو سٹرپٹومائی سین کے پرمٹ اور تین آنے کے سوا اور کیا ملا ہوگا۔ (۲۶)

گویا یہ برائی جان لیوا جرم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسا سماج جہاں ہر قدم پر آپ کو خطرہ ہے، آپ کی جان ، مال اور جیب کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں تعلیم بھی سوچوں کا رخ تبدیل نہیں کر سکتی۔ صدیوں سے بنے سسٹم میں سب بہتے چلے جا رہے ہیں اور تبدیلی کی کہیں کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں اس قسم کے معاشرے کا رونا رویا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں معاشرتی بے حسی کا ذکر کیا ہے اور اس کی وجہ بھی آپس میں لوگوں کی بداعتمادی بتائی ہیں۔

اشفاق احمد نے بعض لوگوں کی رویوں میں نفرت اور حقارت کو افسانہ ''بابا'' میں بے نقاب کیا ہے۔ جب وہ بہو کے لیے ڈاکٹروں اور نرسوں کو بلانے کے لیے جاتا ہے تو کوئی بھی اس کے ساتھ آنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ وہ لکھتے ہیں:

> بابا نے کہا'' آپ کوئی موٹر لے لیجئے ٹیکسی لے لیجیے میں کرایہ ادا کروں گا۔ دوگنا کرایہ دوں گا ۔آپ کو دس گنا فیس دینے کا وعدہ کرتا ہوں، مگر میرے ساتھ ضرور چلیے ۔میری بہو کو بچا لیجئے ۔''نا بابا نا'' دو تین نرسوں نے یک زبان ہو کر کہا۔''جب ڈاکٹر لوگ نہیں جاتے تو ہم کیا کریں ۔پھر اسی نرس نے کہا''بابا اپنی بہو کو جا کر دم کرو۔ اچھی ہو جائے گی'' اور ساری نرسیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ (۲۷)

گویا اس بے حسی کا شکار ہو کر بابا کی بہو''ایلن'' سخت اذیت میں مبتلا ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی بھی اس کے علاج کے لیے نہیں آتا ہے۔ جس سماج میں ڈاکٹر و اور نرسوں کی زبان اور انداز اس قدر غیر سنجیدہ اور گستاخانہ ہوگا وہ زندگیوں کا ضامن کونسا پیشہ کہلائے گا۔

اشفاق احمد یقیناً ان معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کر کے ان میں بہتری لانا چاہتے ہیں۔ اشفاق احمد نے افسانہ ''پناہیں'' میں سختی سے بچوں کو مارنے کی مذمت کی ہے اور اس مار پیٹ سے پیدا ہونے والے منفی اثرات کو بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں ایک کردار'' آصف'' ہنستا کھیلتا، شرارتی اور ذہین بچہ تھا۔ جو ماں باپ کی آپس میں چپقلش کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے، اشفاق احمد لکھتے ہیں:

اسے پھر اماں کے پاس بھیج دیا گیا، لیکن اماں صرف جھڑکیوں اور گھرکیوں پر ہی اکتفا نہ کرتیں ۔کبھی کبھار ایک آدھ طمانچہ یا دھموکا بھی لگا دیتیں اور پھر آصف سے تو انہیں خاص چڑ تھی جو بیٹھے بٹھائے ابا کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا تھا۔(۲۸)

اسی طرح باپ سے محبت کی وجہ سے آصف ماں کی ممتا سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور پھر جب اس کی ماں خاص طور پر اس کے ابا کو سنانے کے لیے لمبی چوڑی تقریر کرتی ہے کہ جب آصف باپ کے ساتھ جانے کے لیے ضد کرتا ہے اور ڈاکٹر صاحب (آصف کا باپ) رضامند نہیں ہوتے تو کہتی ہیں کہ:

کیا کرے گا وہاں جا کر؟ پہلے کون سی ایسی خاطر ہوئی جو اب پھر تیار ہو گیا ہے۔ایک بار جو شرما شرمی لے گئے تو اسی پر بھول بیٹھا۔ذرا آئینے میں اپنا حلیہ تو دیکھ، ہلدی کی گانٹھ بنا ہوا ہے۔دو دن بخار چڑھا اور اٹھا کے میرے پاس بھیج دیا۔کسی کی بکری کون ڈالے گھاس! باپ کا دل اور ایسا کھٹور ۔پھر کوئی تجھ سے پوچھے جب وہ میری نہیں سنتا تو تیری کیسے مانے گا! ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی۔اسے اپنے کھل کھیلنے سے فرصت ہو تو تیری خبر گیری کرے۔وہاں چپڑی سے یہاں کی روکھی اچھی۔میرے تھپڑوں سے وہاں کی سڑی بساندھی باتیں اچھی نہیں؟ جہاں میں آفت کی ماری ٹھڈا ٹوٹی پڑی ہوں تو بھی نچلا ہو کے بیٹھا رہ۔محلوں کے خواب دیکھے گا تو جھونپڑے کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔(۲۹)

یہ باتیں ماں کیے جا رہی ہے، اس کا مقصد محض اپنے شوہر کو سنانا ہے بچے کی شخصیت پر اس کے کیا اثرات ہو رہے ہیں وہ اس سے بے خبر، دل کی بھڑاس نکالے جا رہی ہے اور پھر ڈاکٹر، آصف کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوتے ہیں اور راستے میں جو اس کے ساتھ سلوک کرتے ہیں وہ قابل رحم اور قابل مذمت ہے۔اشفاق احمد لکھتے ہیں:

اس کے منہ سے مسلسل چیخوں کے علاوہ ''ابا میری توبہ! ابا جی میری توبہ! الرز لرز کر نکل رہا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب ایک ہی رفتا سے پیٹے جاتے تھے ''حرام زادے، چغل خور، لگائی بجھائی کرتا ہے ۔اس کمینی سے میری شکایتیں کرتا ہے۔اب درست ہو جائے گا ذلیل انسان، کتے کی اولاد ۔سور کا بچہ۔۔۔ایسی دوں فطرت عورت میرے منہ آئے۔ایک سید زادے کے منہ، جس نے آج تک کسی سے تو نہیں کہلوایا۔تو نہیں کہلوایا، حرام زادے تو نہیں کہلوایا'' اور پھر ہر تو کے ساتھ کنڈے کی ''ژوں'' میں بھی اضافہ ہوتا گیا مگر ادھر سے وہی صدا بلند ہوئی۔وہی ''ابا جی میری توبہ، ابا جی میری توبہ!'' جو آہستہ آہستہ دیووں کے کنویں میں محبوس سیاہ آنکھوں والی آدم زاد کی سسکیاں بنتی گئی۔(۳۰)

چار برس کے بچے کے ساتھ یہ اذیت ناک برتاؤ، اپنی بیوی کی طرف سے سارا غصہ اس سرکنڈے میں منتقل ہو کر نازک بدن پر معصوم ذہن پر برستا رہا اور آصف واقعی بدل گیا۔ اس کے اولاد کے بقول ''اب تو درست ہو جائے گا'' تو وہ ایسا درست ہوا کہ باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کی شخصیت کا اعتماد لوٹ نہ سکا۔ اشفاق احمد یوں لکھتے ہیں:

> اب ہسپتال میں نہ کوئی شرارت ہوتی تھی۔ نہ شور مچتا تھا۔ اسلم کی ماں نے کئی مرتبہ اسلم سے کہا کہ اپنے دوست کو بھی کہانیاں سنانے کے لیے لایا کر۔ مگر دوست آتا تو اسلم لاتا۔ کئی مرتبہ اسلم نے ریت کے گھر بنانے کی تجویز پیش کی۔ پچھلے دنوں کی مزیدار کھیلیں یاد کرائیں۔ ہسپتال سے چیزیں چرانے کا لالچ دیا مگر وہ نہیں مانتا۔ (۳۱)

اس طرح ایک معصوم بچہ اپنے باپ کی مار پیٹ کی وجہ سے اپنے بچپن کو ہمیشہ کے لیے کھو دیتا ہے اور لاکھ کوششوں کے باوجود واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ ڈاکٹر صاحب وہ پہلا والا اصف دیکھنا چاہتے تھے اس کی شرارتوں پر ہنسنا چاہتے تھے اس سے باتیں کرنا چاہتے تھے لیکن وہ مار پیٹ کبھی بھی فراموش نہیں کر پاتا اور اصف کی ساری بے باکی، محبت، پیار، خلوص، بہادری، بھروسا سب مار کی نذر ہو کر خوف میں تبدیل ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب اپنے بیٹے کو منانے میں بے بس ہو جاتے۔ اشفاق احمد نے اس افسانے میں معاشرے کی اس برائی کو نہایت حکیمانہ طور پر ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہ محض بچوں کے والدین کو یہ تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ آپ کا آپس میں رشتہ کچھ بھی ہو لیکن بچوں کے سامنے زبان اور ہاتھ کو قابو میں رکھیں اور اپنی محرومیوں کا آزالہ بچوں کے ساتھ ناروا سلوک کر کے نہ کریں اور نہ ہی کوئی ایسا رویہ ان کے ساتھ رکھیں کہ عمر بھر کے لیے ان کو کھو دیں۔

اشفاق احمد سماج کے اندر ہونے والے حالات سے باخبر افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے معاشرے میں روایتی برائیوں پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ افسانہ ''امی'' میں انہوں نے کئی معاشرتی برائیوں کو بیان کیا ہیں۔ اس افسانے میں ''مسعود'' کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ مسعود کی ماں اس کی تعلیم و تربیت کے لیے دوسری شادی کرتی ہے لیکن وہ اسی بات کو بھول جاتی ہے جیسا کہ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> مسعود کی ماں نے اپنے خاوند کی موت کے ایک سال بعد ہی اپنے کسی دور کے رشتہ دار سے شادی کر لی تھی۔ اول اول تو اس کی دوسری شادی کا مقصد مسعود کی تعلیم و تربیت تھی لیکن اپنے دوسرے خاوند کی جابرانہ طبیعت کے سامنے اسے مسعود کو تقریباً بھلا ہی دینا پڑا۔ (۳۲)

اس افسانے میں مسعود کی ماں بھی اپنی نہ رہی اور جب ان کو جابر سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر رہنا پڑا تو اس کا رشتہ اپنی ماں سے بھی ٹوٹ گیا۔ ساتھ ساتھ اس افسانے میں مسعود کی شخصیت کے دو رخ نمایاں ہیں۔ ایک طرف

ماں ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن لاپروا رہی ۔۔۔۔۔۔دوسری ''امی'' ہیں جو دوست کی ماں ہے لیکن اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتی ہے اور مسعود بھی ان کی عزت دل سے کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب مسعود کے دوست ''گلریز'' کو روپوں کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ قرض لے کر جوا کھیلنے چلا جاتا ہے اور اٹھارہ سو روپے لے کر گھر کی طرف بڑھتا ہے اور اسی فکر میں ڈوبا ہوا ہے کہ باقی دو سو روپے کہاں سے آئیں گے۔اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> پھر وہ اپنے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگا اور سوچنے لگا کہ تو کل اٹھارہ سو ہوئے اور گلریز نے دو ہزار مانگے ہیں۔باقی دو سو کا بندوبست کیوں کر ہوگا اور وہ ابھی باقی دو سو کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے گلے میں صافہ ڈال کر اسے زمین پر گرا دیا۔گرتے ہی ایک تیز دھار چاقو کا لمبا پھل اس کے سینے سے گزر کر دل میں اتر گیا۔(۳۳)

اسی طرح مسعود اپنے دوست گلریز اور امی کی ضرورت کو پورا کرنے کی فکر میں اپنی جان بھی گنوا بیٹھتا ہے ۔سماج میں برے راستوں پر چلنے کا انجام بھی برا ہوتا ہے ۔لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان برائیوں کے راستوں پر قدم کیسے اٹھتے ہیں۔اس افسانے میں اشفاق احمد نے وہ حالات کھلے لفظوں میں بیان کر دیے ہیں کہ کس طرح ہماری بچپن کے حالات و واقعات اور سماج کا برا ماحول ہمارے مستقبل کے راستے متعین کرتے ہیں۔

اس افسانے میں مسعود چاہتے ہوئے بھی امی کی مدد نہیں کر پایا۔اشفاق احمد معاشرے میں ایسے فرد کو نیک نیتی کے باوجود موت کا شکار ہوتا دکھا کر قارئین پر یہ بات واضح کر دیتے ہیں کہ برائی کے راستوں پر چلنے کا نتیجہ برا ہی ہوتا ہے چاہے آپ کے حالات کیسے بھی ہوں۔فرد کو صراط مستقیم پر چل کر دنیا و آخرت میں کامیابی و سرخروئی حاصل ہو سکتی ہے۔جوئے کی لت کے شکار انسان کی موت یہ اشارہ کرتی ہے کہ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کی نیکیاں بھی چھین لیتا ہے اور یہ توفیق نہیں دیتا کہ انسان اپنی دولت نیک مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔اشفاق احمد سماج سے ان جیسی برائیوں کا خاتمہ کر کے اعلیٰ معاشرتی اقدار کی نشو و نما چاہتے ہیں۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جس طرح سماجی اقدار زوال پذیر ہوئیں،جس طرح مادیت ہمارے خون میں جذب ہو کر رہ گئی ،انسان جس طرح انسانیت کی معراج سے گر گیا،جس طرح مادی فوائد اور نقصانات نے انسانی محبتوں اور رشتوں پر اثر انداز ہونا شروع کیا،ہوس زر نے آرزوں اور خوابوں کو پامال کیا اس کی جھلکیاں اشفاق احمد کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

افسانہ ''سونی'' میں اشفاق احمد نے معاشرے میں اس برائی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بعض دولت مند گھرانے آپس میں شادیاں محض مالی مفادات کو دیکھتے ہوئے کرتے ہیں۔اس افسانے میں دو بہت امیر والدین کے بچوں خجستہ اور بختیار کی شادی کی کہانی ہے۔یہ شادی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے نہیں بلکہ مالی ہم آہنگی کی بنا پر ہوتی

ہے جیسا کہ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> دونوں نے اپنی زندگی میں چونکہ سوائے اپنے کام کے اور سوائے اپنے نام کے اور کسی چیز سے محبت نہیں کی تھی اس لیے وہ ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہیں پہلی دفعہ پتہ چلا کہ دام کے مقابلے میں چام سے بھی اتنی ہی محبت کی جاسکتی ہے اور اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ دونوں کے والدین اس بات پر نازاں تھے کہ ان کے بچے اگر ہم خیال نہیں تو ہم حال ضرور ہیں اور شادی اور دوستی میں ہم خیال ہونا اتنا ضروری نہیں جس قدر ہم حال ہونا ضروری ہے۔ (۳۴)

اس افسانے میں چونکہ پہلے ہی سے خجستہ اور بختیار دونوں کے دلوں میں محبت کی قندیل دکھائی نہیں دیتی اس لیے ہنی مون سے واپسی کے بعد جو دیوار ان کے درمیان حائل ہوتا ہے وہ محبت کی عدم موجودگی ہے۔ اشفاق احمد یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس قسم کی شادی دو دلوں کو جوڑنے کے لیے نہیں بلکہ مالی تحفظ کے لیے ہوتی ہے ۔صرف ایک فرض پورا کیا جاتا ہے ورنہ اصلی محبت کا کہیں نام ونشان تک نہیں ملتا:

> خجستہ اور بختیار کے درمیان بھی جس لذت اور ذائقے نے جنم لیا تھا وہ ہنی مون سے واپسی پر آہستہ آہستہ ماند پڑنے لگا اور دونوں اپنی اپنی ذات کو الگ الگ ہینگر پر ڈال کر اسے برش کرتے ہوئے اپنی شخصیت نکھارنے لگے۔ (۳۵)

خجستہ اور بختیار دونوں کو دولت سے خریدی ہوئی چیزوں سے محبت ہے۔ انسانی جذبات کا کوئی لحاظ اور خیال نہیں۔ دونوں کی ساری خوشیاں ان چیزوں سے وابستہ تھیں جو ان کی ملکیت تھیں۔ ایک دوسرے کی چیزیں انہیں کوئی خوشی اور سرور نہ دے سکیں۔ انہیں آپس میں قطعاً محبت نہیں اور اگر محبت کا نشان کہیں دکھائی دیتا ہے تو مادی وسائل سے ہے۔ انہیں اپنی بے جان اشیاء اور آلات سے انتہائی محبت ہے جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے صاف ظاہر ہے:

> خجستہ نے کہا ''بختیار! تم اپنا وی سی آر مجھے دیتے جاؤ تا کہ اگر خدانخواستہ میرا خراب ہو جائے تو میں اور میری فرینڈز فلمیں دیکھنے سے محروم نہ رہ جائیں'' بختیار نے کہا ''تم اپنے لیے ایک اور خرید لو لیکن میرا گچٹ مجھ سے نہ مانگو۔ میں ان سے وابستہ ہو جاتا ہوں وران کو اپنے آپ سے جدا نہیں کرسکتا۔ ان میں میری جان ہے۔ (۳۶)

اس افسانے میں اشفاق احمد سماج سے ان برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ محض مالی مفادات وتحفظات کو محبت پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوگ صرف مال و دولت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ یہ بات اشفاق احمد کے ہاں ایک بڑی سماجی برائی اور محبت کی یقینی موت ہے۔

اشفاق احمد کا افسانہ ''بندرابن کی کنج گلی میں'' کئی سماجی برائیوں کا احاطہ کرتا ہے۔اس افسانے کا ایک پہلو ''کلثوم'' نامی لڑکی ہے۔کلثوم امیر گھرانے کی چشم و چراغ ہے لیکن ان کے گھرانے کے سب لوگ محض دولت کی پوجا کرتے ہیں اور لطیف جذبات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کلثوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> میرا کوئی ساتھی نہیں۔ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر ہیں ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے۔(۳۷)

اس افسانے میں جب کلثوم بیمار پڑ جاتی ہے اور ہسپتال میں زیر علاج زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے پھر بھی ان کے والد اپنے کاروباری معاملات میں مشغول ہونے کی وجہ سے اپنی بچی کو اس کے حصے کا وقت اور محبت نہ دے سکا۔اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب نے سیٹھ کا کندھا تھپتھپا کر کہا ''گھبراؤ نہیں سیٹھ بچ جائیں گا، بچ جائیں گا! یہ کوئی خطرناک بیماری نہیں دورہ پڑا ہے۔ٹھیک ہو جائیں گا۔'' تو میں جاؤں؟ سیٹھ نے پوچھا ''جاؤ! جاؤ ۔ڈاکٹر نے آستین چڑھا کر کہا۔''کب واپس آئیں گا ؟''کل دوپہر کو، سیٹھ نے سوچ کر کہا ۔کراچی کسٹم کا تار آیا ہے ادھر ہمارے امپورٹ مال کا جھگڑا ہے میں جاتے ہی کھلاس کرالوں گا ۔(۳۸)

اکثر معاشروں میں ان برائیوں کو دیکھا جا سکتا ہے جن کی نشاندہی اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں کی ہیں۔اسی افسانے کا دوسرا پہلو ایک لڑکا ''نمدار'' ہے۔نمدار غریب مچھیرے کا بیٹا ہے۔جو بی۔اے کرنے کے لیے لاہور میں داخلہ لیتا ہے۔لاہور آ کر لوگ اسے نمدار صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔یہاں کے ماحول نے اسے اپنی مفلسی اور غربت پوشیدہ رکھنے اور بڑا بننے پر مجبور کیا تھا لیکن بڑوں کے اس بڑے شہر میں نمدار بڑا نہ بن سکا۔

اشفاق احمد نے بہت سی سماجی برائیوں کا ذکر اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔یہ معاشرتی برائیاں ہونے کے ساتھ ساتھ محبت کے راستے میں حائل ہوتی نظر آتی ہیں۔انہوں نے ان برائیوں کو ختم کرنے کی حتی الوسع سعی کی ہیں۔اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کا کوئی پہلو بھی ادھورا نہیں چھوڑا بلکہ سماج میں محبت کی ترویج اور نفرت وعداوت کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔انہوں نے محبت کے دوسرے گوشوں کی طرح محبت اور گھریلو زندگی سے متعلق گوشے کا بھی بھرپور ذکر کیا ہے اور قائین پر یہ بات واضح کی ہے کہ گھریلو زندگی کو کس طرح خوشگوار اور پرامن طور پر گزارا جا سکتا ہے۔

اشفاق احمد اپنے افسانے ''بدلی سے بدلی تک'' میں عاشق خاوندوں کو اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ شادی کے بعد اپنی بیویوں کے ساتھ پیار و محبت کا رویہ اپنانا چاہیے اور اپنی بیویوں پر توجہ دینی چاہیے ان کے لیے وقت نکالنا چاہیے تاکہ وہ بری باتوں کی طرف راغب نہ ہو سکیں۔ اگر ماضی کا کوئی ناخوشگوار واقعہ ہو بھی تو اس کو ترک کر دینا چاہیے نہ کہ بار بار ماضی کی یاد ستائے اور انسان کے دل میں نہ چاہتے ہوئے بھی برے خیالات اور ارادے پیدا ہوں اس افسانے میں محبوب ہی خاوند بن جاتا ہے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> محمودہ کا اندازہ تھا کہ اس کی شادی کے بعد ناصر نگری نگری پھرے گا اور گھر کا رستہ بھول جائے گا ۔مگر ناصر گھر کا رستہ نہ بھول سکا اور ان نگریوں کو بھول گیا جو محمودہ نے بسائی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ شادی کے بعد اس کی داستان محبت کا ایک آدھ باب اس کے خاوند تک ضرور پہنچے گا۔ وہ عمر بھر ساری کہانی سننے کے لیے اصرار کرتا رہے گا اور وہ مکرتی رہے گی۔ زبان سے انکار کرتی جائے گی لیکن آنکھوں سے بیان کرتی رہے گی اور جہاں اس کے خاوند کو جذبہ رقابت سے تکلیف پہنچے گی ،وہاں مسرت بھی ہوگی کہ میری بیوی کوئی معمولی عورت نہیں ،لوگ اس کے آستان ناز پر سر نیاز بھی جھکاتے رہے ہیں۔ لیکن یوں نہ ہو سکا۔ اس کے خاوند نے اس سلسلے میں کبھی گفتگو ہی نہ کی اور اگر کی بھی تو اس میں استفسار کا پہلو نہ پیدا ہوا۔ محمودہ کا خاوند نہ الہڑ تھا نہ غصیل اور نہ ہی بات پر روٹھنے والا محبوب۔(۳۹)

اشفاق احمد کے مطابق عاشق کو شوہر بننے کے بعد اپنی محبت کی شدت کو قائم رکھنا چاہیے نہ کہ وہ بیوی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیں کہ عاشق اور ہوتا ہے اور شوہر کوئی اور ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسی صورت حال میں ایک خوشحال گھرانے کا توازن بگاڑ کا شکار ہو سکتا ہے۔ بیوی محبوب کی یادوں میں کھو کر خاوند کو بھلا دے گی یا اس عاشق کو ڈھونڈنے میں اپنے آپ کو وقف کر دے گی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ برائی کے راستے پر چل پڑے کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ انسان جتنا پیار چاہتا ہے اگر اس سے کم ملے یا جتنا پیار اسے ملتا رہے اس سے کم ملے تو اس کی ذات میں ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے وہ ہر صورت میں بھرنا چاہتا ہے، چاہے اسے کوئی بھی حل طلب راستہ اپنانا پڑے ۔اشفاق احمد ایسی ہی صورت حال سے سماج میں بسنے والے لوگوں کو بچانا چاہتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں سے مرد اور عورت کی روایتی حیاتیاتی تقسیم ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ انہوں نے مرد و زن کو زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کرتے دکھایا ہے۔ نیاز خان اپنے ایم فل کے مقالے اشفاق احمد کی افسانہ نگاری میں لکھتے ہیں:

اشفاق احمد کے ہاں روایتی مظلوم اور بے بس عورت کم دکھائی دیتی ہے۔ان کے مردانہ کردار غلبے کی علامت نہیں بلکہ محبت کرنے والے اور عورت کا ساتھ دینے والے ہیں۔عورت چونکہ جسمانی طور پر مرد کی نسبت کمزور ہے اس لیے وہ مرد کی برابری نہیں کر سکتی ،محبتوں میں بھی مرد آزاد ہے کہ وہ جتنی لڑکیوں سے چاہے محبت کرے لیکن عورت اپنی جسمانی ساخت اور خیالات کی وجہ سے وفا کرنے پر مجبور ہے۔(۴۰)

اشفاق احمد نے محبت اور گھریلو زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ ان کے پسندیدہ عنوانات میں سے تھے جیسا کہ پروفیسر وقار عظیم نے بھی ان موضوعات کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے:

محبت ،گھریلو زندگی ،معصوم بچے۔۔۔۔۔یہ چیزیں شفاق احمد کے دل پسند موضوعات ہیں لیکن ایک اور موضوع جو زمانے کے اثر نے انہیں دیا ہے۔انسانی ذہن کی اس کیفیت کی مصوری ہے جو حال کی زندگی کے انتشار اور اضطراب نے پیدا کی ہے۔(۴۱)

اشفاق احمد کے ہاں کامیاب گھریلو زندگی محبت کی مرہون منت ہے۔بکھرے ہوئے اور منتشر گھروں کی شیرازہ بندی محبت ہی کی وجہ سے ممکن ہے۔افسانہ ''فہیم'' میں بیان کرتے ہیں کہ گھر کے تمام افراد سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے خصوصاً خاندان کے چھوٹے بچوں سے تو انتہائی محبت ،نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آنا چاہیے کیونکہ چھوٹے بچے معصوم ہوتے ہیں۔اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

مگر تمہارے نانا نے کبھی ان کو پھول کی چھڑی تک نہ ماری۔کیا کرتے تھے بچے تو فرشتے ہوتے ہیں ،ان کو مارنا گناہ ہے۔تمہاری کراچی والی خالہ دن بھر محلّہ کی تیلنوں اور جولاہی سہیلیوں سے کھیلتی رہتی اور جب شام کو گھر واپس آتی تو کپڑے میلے ،چیکٹ اور جھونٹوں میں من من خاک ۔میں دست پناہ لے کر مارنے لگتی ہے تو گود میں اٹھا کر باہر نکل جاتے۔میں کہتی تم اسے خراب کر دو گے تو الٹا مسکرانے لگتے ہیں کہ فرشتے کبھی خراب نہیں ہوتے۔(۴۲)

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور گھریلو زندگی کی جو جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔یہ ان کے تجربات اور گہرے مشاہدے کی عکاسی کرتی ہیں کیونکہ انہوں نے محبت اور گھریلو زندگی کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اشفاق احمد سماج کے حوالے سے قارئین اور معاشرے کے دوسرے افراد میں مثبت تبدیلی کے خواہاں ہیں۔

(ب) طبقاتی کشمکش

طبقاتی کشمکش سے مراد جدید سماج میں اقتصادی گروہوں کا ایک دوسرے کے خلاف باہمی مخاصمت کا اظہار اور ہر گروہ کا دوسرے گروہ کا استحصال کر کے اپنی طاقت، مرتبے اور دولت میں اضافہ کرنا ہے۔

زر پرستی کا لازمی انجام دولت کی غیر مساوی تقسیم ہے جس کے نتیجے میں کچھ لوگ امیر سے امیر تر اور اکثریت مفلس تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک غریب آدمی جب خود کو بنیادی ضروریات سے بھی محروم اور دوسروں کے پاس دولت کے انبار دیکھتا ہے تو اس میں مجرمانہ ذہنیت جنم لیتی ہے۔ اس کے اندر وہ احساس محرومی پیدا ہوتا ہے جو معاشرے میں ایک چور، ڈاکو اور بدعنوان شخص کو جنم دیتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سماج کا امن وسکون غارت کر دیتے ہیں۔ غربت وافلاس کی ماری لڑکیاں جب اپنے گھروں سے نکلتی ہیں تو دولت کی چکا چوند انہیں حیا کے راہوں سے بھٹکا دیتی ہے بعض کے پاس تو اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ اپنا جسم بیچ کر اپنے خاندان کی ضروریات پوری کریں۔۔ بلند وبالا اور عالیشان بنگلوں کی فراوانی، چمکتی دمکتی گاڑیوں کا اژدہام اور قیمتی لباس پہنے خوشحال لوگوں کا نظارہ جب وہ غریب کرتے ہیں جنہیں جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے بھی وسائل فراہم نہیں تو اس کے نتیجے میں ایک زبردست طبقاتی کشمکش جنم لیتی ہے۔ نفرت، بغض اور انتقام کی یہ آگ دھیرے دھیرے سلگتی ہے اور ایک دن پورے سماج کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

طبقاتی کشمکش سے کیا مراد ہے؟ یا طبقاتی کشمکش کسے کہتے ہیں؟ اس کے متعلق ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھتے ہیں:

> دنیا میں نادار اور زردار طبقوں کے درمیان تصادم مفادات کے باعث جو آویزش جاری ہے اسے اشتراکی مصنفین کی اصطلاح میں طبقاتی کشمکش کہا جاتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کی بنیاد اگرچہ معاشی عدم مساوات پر ہے لیکن اس کا اظہار اقتصادی میدان کے علاوہ سیاسی کشمکش اور نظریاتی آویزش کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔ (۴۳)

سماج میں طبقاتی کشمکش دو طبقوں کے درمیان چلی آرہی ہے۔ ایک طبقہ سرمایہ داروں کا ہے اور دوسرا طبقہ استحصال زدہ لوگوں کا ہے۔ کارل مارکس نے بھی سماج میں طبقاتی کشمکش کے حوالے سے دو طبقوں میں کچھ یوں ذکر کیا ہے:

> کارل مارکس کے نزدیک طبقے دو ہیں:
>
> ا۔ بورژوا:

یہ استحصال کرنے والوں کا طبقہ ہے اس میں سرمایہ دار لوگ شامل ہیں۔یعنی وہ لوگ جن کا ذرائع پیداوار پر قبضہ ہے۔

۲۔ پرولتاری یا پرولتاریہ۔

وہ محنت کش لوگ جنہیں زندہ رہنے کے لیے اول الذکر طبقے کے پاس اپنی محنت بیچنی پڑتی ہے۔(۴۴)

سماج میں ان دو طبقوں کے مابین ایک مسلسل آویزش جاری ہے۔ جسے طبقاتی کشمکش کہتے ہیں۔کارل مارکس کے نزدیک ان طبقوں میں مفاہمت بھی ناممکن ہے۔اس تضاد کا صرف ایک حل یہی ہے کہ پرولتاری آمریت کے تحت ایک غیر طبقاتی سماج قائم کر دیا جائے۔غیر طبقاتی سماج سے مراد وہ سماج ہے جس میں ہر شخص سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق کام لیا جاتا ہو اور اس کی ضروریات کے مطابق اسے دیا جاتا ہو۔جس میں تمام ذرائع پیداوار مشترکہ ملکیت ہوں اور کوئی فرد اس پوزیشن میں نہ ہو کہ کسی دوسرے کی محنت کا استحصال کر سکے۔

طبقاتی کشمکش یا طبقاتی جدوجہد حقیقت میں اس مخاصمت اور کشیدگی کا بیانیہ ہے جو دو یا دو سے زائد طبقات کے افراد کے درمیان اقتصادی، سماجی مفادات کے حصول کے لیے پیدا ہو جاتی ہے یہی طبقاتی کشمکش ہی معاشرے میں بنیاد پرست معاشرتی تصادم کا سبب بنتی ہے، مثلاً سستے مزدوروں اور وسائل کے لیے براہ راست جنگیں، افلاس، بھوک، بیماری یا غیر محفوظ کام کرنے کے حالات کی وجہ سے ہونے والی اموات جیسے بالواسطہ تشدد بھی طبقاتی کشمکش ہی کے اشکال ہیں۔دریں اثنا ملازمت کے کھو جانے کا اندیشہ اور سرمایہ داروں کی جانب سے سرمایہ کاری میں مندی کے رجحان جیسے جبر بھی اسی طبقاتی کشمکش کے زمرے میں آتے ہیں۔

معاشرتی پیداوار اور اس کی تقسیم، سماجی حیثیت و مرتبہ اور مال و دولت کی بنیاد پر طبقات میں منقسم سماج میں طبقاتی کشمکش کا موجود ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔ایک سرمایہ دارانہ نظام اپنے اندر ''طبقاتی کشمکش'' کی بہترین مثال ہے۔ جہاں طبقاتی کشمکش بنیادی طور پر بورژوازی اور پرولتاری کے مابین ہو رہی ہے۔اس کشمکش کی بنیاد ''کام، مزدوری کے اوقات، اجرت کی قدر، منافع کی تقسیم، پیداوار کی لاگت، مزدوری لینے کے طریقہ کار، پارلیمنٹ یا بیورو کریسی پر کنٹرول اور اقتصادی عدم مساوات'' پر ہوتی ہے۔

ہمارا سماج طبقاتی ہے، ہر طبقاتی سماج میں انسان طبقات میں منقسم ہوتے ہیں۔اب تک جتنی بھی سماجی تنظیمیں وجود پذیر ہوئی ہیں۔ان میں ابتدائی اشتراکی سماج کو چھوڑ کر سب میں یہ طبقات موجود رہے ہیں۔غلام داری سماج میں آقا اور غلام، جاگیردارانہ سماج میں جاگیردار اور کسان اور سرمایہ دارانہ نظام سماج میں سرمایہ دار اور مزدور جیسے طبقات موجود رہے ہیں۔

معاشرہ طبقات میں اس وقت تقسیم ہوا جب چند لوگوں نے کچھ چیزوں کو اپنی ذاتی ملکیت بنالیا۔ ابتداء میں زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی تھی۔ سب لوگ آپس میں مل کر کھیتی باڑی کرتے تھے اور پیداوار آپس میں بانٹ دیتے تھے لیکن معلوم نہیں کب اور کس شخص نے کسی قطعہ زمین پر اپنی ملکیت قائم کرلی اور یہ کہا یہ میری زمین ہے۔

یوں ذرائع پیداوار میں ذاتی ملکیت کی ابتداء ہوئی اور یہی ذاتی ملکیت طبقات کے وجود میں آنے کا سبب بن گئی۔ جن افراد نے ذرائع پیداوار پر قبضہ کرلیا ان کو اپنی ملکیت قرار دے دیا۔ وہ ایک طبقہ بن گئے اور جن لوگوں کو ذرائع پیداوار سے محروم کردیا گیا وہ دوسرا طبقہ بن گئے۔

اب اس کے بعد یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ ذرائع پیداوار سے محروم افراد اس بات پر مجبور ہوئے کہ وہ ذرائع پیداوار کے مالک لوگوں کے لیے کام کریں۔ ان ذرائع پیداوار پر جو اب ان کی ملکیت نہیں تھے اپنی محنت صرف کریں اور جو کچھ پیدا کریں ان میں سے کچھ حصہ یعنی اتنا حصہ جتنے پر وہ زندہ رہ سکیں لے لیں اور باقیہ ذرائع پیداوار کے مالک افراد کے سپرد کردیں۔ اس طرح انسانی محنت کے استحصال اور لوٹ کے سلسلے کی ابتداء ہوئی۔ پھر اس لوٹ کو برقرار رکھنے اور استحصال کو مستقل بنانے کے لیے ذرائع پیداوار کے مالک لوگوں نے جبر وتشدد اور ظلم وزیادتی اور ناانصافی سے کام لینا شروع کردیا۔ اس طرح طبقاتی سماج استحصالی ہونے کے ساتھ ساتھ ظالمانہ اور جابرانہ سماج بھی بن گیا۔ یہ جبر، ظلم اور استحصال ہر سماجی تنظیم میں جاری رہا۔ ہر تنظیم میں لوٹنے والے اور لوٹے جانے والے، ظلم کرنے والے اور ظلم سہنے والے طبقات موجود رہے اور ان دونوں کے مابین کشمکش بھی جاری رہی۔ یہی طبقاتی کشمکش ہی انسانی سماج کی تاریخ میں معاشروں کے تغیر وتبدل اور ان کے ارتقاء کا قانون رہی ہے۔ تاریخ صدیوں سے غلط لکھی اور پڑھائی جارہی ہے اور یہ باور کروایا جاتا رہا اور کرایا جارہا ہے کہ تاریخ بادشاہ، سپہ سالار اور عظیم لوگ بناتے ہیں، آگے بڑھاتے اور اسے بدلتے ہیں۔ بے شک ان لوگوں کا بھی ایک کردار ضرور ہوتا ہے لیکن یہ کردار انہیں طبقاتی کشمکش عطا کرتی ہے۔ یہ لوگ حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور تاریخ کی ضرورت اور وقت ان کا پیچھا کرتا ہے اور برسرکار لے آتا ہے۔

سماجی ارتقاء کا محرک طبقاتی کشمکش ہوتی ہے۔ یہ کشمکش ذرائع پیداوار کے مالک اور ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم رہنے والے طبقوں کے مابین ہوتی ہے۔ دونوں طبقے ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی۔ انقلاب اس کشمکش کو ختم کردیتا ہے۔ سماجی انقلاب کے لیے اٹھنے والی صدا طاقتور طبقے کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جاتی ہے وہ ہر اس آواز کو دبا دیتے ہیں جو سماجی انقلاب کے لیے بلند ہو اور ہر اس قلم کو توڑ دیتے ہیں جو انقلاب کے لیے لکھتا ہو۔

پاکستان میں یہ طبقات سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں۔ ابتداء میں یہ ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف تھے لیکن عوام میں بیداری کے آثار دیکھ کر اب یہ ایک دوسرے کے دوست اور حلیف بن گئے ہیں چونکہ سامراج ان کی بالا دستی برقرار رکھنے کے خواہاں ہیں لہذا یہ طبقات بھی سامراج کے پٹھو اور دلال ہیں۔ یہ سامراجی مالکوں کی مرضی کے مطابق حکومت کرتے اور محنت کش عوام کا گلا گھونٹتے ہیں۔ پاکستان میں جاگیردار اور سرمایہ دار طبقات اس وقت یکجا ہو کر سامراجی مالکوں کی تائید وحمایت کے ساتھ اپنے ملک میں جبر واستحصال اور لوٹ کے نظام کو قائم رکھے ہوئے ہیں اور جب تک ان کا بس چلے گا وہ اس غیر فطری اور غیر انسانی معاشرتی نظام کو قائم رکھیں گے۔

اشفاق احمد اگرچہ ترقی پسند تحریک سے منسلک نہیں تھے لیکن محنت کشوں کے حقوق کے لیے جس طرح اشفاق احمد نے قلم اٹھایا ہے شاید ہی کوئی بھی محنت کشوں کی حق تلفی کے ایسے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنا سکا ہو۔ یعنی اشفاق احمد چونکہ ترقی پسند ادیب نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنے افسانوں میں طبقاتی شعور کا اظہار کیا ہے۔ اپنے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف جا بجا آواز بلند کی ہے اور طبقاتی تقسیم کا بھی بار بار ذکر کیا ہے کہ موجودہ سماج میں عزت وآبرو کا رشتہ مال، دولت سے ہے نہ کہ علم ودانش سے۔ جس کے پاس دھن دولت کی کثرت وفراوانی ہوگی دنیا اسی کو سلام کریگی۔ اس کی مثال وہ اپنے افسانے ''تنکہ'' میں بیان کرتے ہیں۔ جہاں رتبے خان کی نسبت ،گاؤں کے پیرزادہ صاحب کی عزت واکرام ہے کیونکہ ان کے پاس مال ودولت کی فراوانی ہے جبکہ رتبے خان کے ملٹری کراس کی وہ عزت نہیں ہے کیونکہ لوگوں کی سوچ ہی ایسی نہیں ہے کہ سونے چاندی اور مال ودولت سے آگے بھی سوچ سکیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> سارا گاؤں پیرزادہ صاحب کی اس لیے عزت کرتا تھا کہ وہ گاؤں کے مالک تھے، ان کی بے شمار زمینیں تھیں۔ ان گنت مزارعے تھے۔ سینکڑوں مویشی تھے اور پیٹیوں کے علاوہ بینکوں میں کتنا ہی روپیہ تھا اور وہ وقت بے وقت لوگوں کو قرض دیتا رہتا تھا اور لوگ سرکار کو اس لیے مان دیتے تھے سرکار کے خزانے بھی روپے سے بھرے ہوئے تھے اور اس کی جاگیریں بہت وسیع تھیں اور ان پر سورج کبھی غروب نہ ہوتا تھا لیکن لوگ رتبے خان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ اس کے پاس ملٹری کراس تھا۔ اس نے گاؤں کی بہو بیٹی کو زندگی میں نہ تاکا تھا اور اس نے کسی کو نہ ستایا تھا۔ وہ باقاعدہ نماز پڑھتا تھا، روزے رکھتا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق خیرات بھی کرتا تھا لیکن لوگ نہ تو چکر کاٹ کر اسے سلام کرنے آتے تھے نہ اس کی آمد پر کھڑے ہوتے تھے۔ (۴۵)

سماج کے لوگ پیرزادہ صاحب کی عزت وقدر اس لیے زیادہ کرتے تھے کہ ان کے پاس روپیہ زیادہ تھا جبکہ رتبے خان کے پاس اس قدر روپیہ پیسہ نہیں تھا۔ اس سماج میں عزت کو اچھائی کے ساتھ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی شرافت کا ہونا عزت کا باعث بن سکتا ہے بلکہ موجودہ سماج کا المیہ ہی یہ ہے کہ یہاں صرف اور صرف روپے پیسے کے

مالک افراد ہی کو عزت بخشی جاتی ہے اور قابل احترام جانا جاتا ہے۔

اسی افسانے میں یہ ''عطیہ'' کی منگنی عزیز الدین سے ہو جاتی ہے تو وہ بجائے احتجاج کے یا اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کے ''سرور'' کو ایک نئے راہ پر ڈال دیتی ہے کہ تم بھی انیس ہزار کماؤ، ڈھیر سارا روپیہ کماؤ تو ابا جی انکار نہیں کریں گے لیکن یہ محبت تو نہیں تھی یا پھر عطیہ کی محبت میں وہ ہمت اور حوصلہ نہیں تھی۔ عطیہ کہتی ہے کہ:

> جب تک تمہارے پاس کافی روپے ہو جائیں گے۔ تم ایک ایک پائی جمع کرتے رہنا اور دو سال بعد اپنی کار میں گاؤں آنا۔ اس وقت تو ابا جی انکار نہ کر سکیں گے۔ سرور سکتے میں آ گیا۔ اس نے اپنی انگلی کے ساتھ میز پر انیس کا ہندسہ لکھا اور پھر اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی صفریں بنانے لگا (۴۶)۔

اس افسانے کے کرداروں اور مکالموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طبقاتی کشمکش کی وجہ سے سماج میں غریب کی کوئی نہیں سنتا جبکہ اس کے برعکس امیر لوگوں کی معاشرے میں ہر کوئی مانتا ہے اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں جب عطیہ ''سرور'' سے کہتی ہے کہ تم دولت جمع کرتے رہو اور اپنی کار خرید کر ہمارے گاؤں آؤ گے تو ''سرور'' خاموش ہو جاتا ہے ''سرور'' کو خاموش دیکھ کر عطیہ کہتی ہے کہ: ''تم تو کہا کرتے تھے کہ تمہیں مجھ سے اتنا پیار ہے کہ تم میرے کسی حکم سے سر نہیں پھیر سکتے۔ اب تم خاموش کیوں ہو گئے؟ میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہاری کار کا انتظار کروں گی۔'' (۴۷)

اس افسانے میں سرور اپنی محبت کو پانے کی تلاش میں چونیوں، اٹھنیوں اور روپیوں کو گننے کی دھن میں اس کے پاس عزیز الدین کے نام ہپی میرج کا تار گزر جاتا ہے اس کو خبر ہی نہیں ہوتی اور اسی طرح ایک دن اس کی اٹھنی پٹڑی پر گر جاتی ہے۔ گاڑی بڑھتی چلی آتی ہے لیکن سرور اٹھنی کو تلاش کرنے میں مگن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اسی طرح محبت کی وہی روایتی کہانی ایک بار پھر انجام کو پہنچ جاتی ہے اور دوسروں کی محبت دم توڑ دیتی ہے۔

اشفاق احمد اس افسانے کے ذریعے سماجی ناہمواریوں اور غیر انسانی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور انہیں بے نقاب کر دیتے ہیں تا کہ ان کو ختم کیا جا سکے۔ تعلیم، خلوص اور انسانیت کی قدر ہو، جہاں محبت کرنا بھی انسان کا اپنا حق سمجھا جائے۔ جہاں مال و دولت کے نام پر سلام نہ کیا جائے۔ جہاں کام کرنے والوں کو بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جائے۔ انیس ہزار روپے کے لیے زندگیاں برباد نہ کی جائیں۔ جہاں اٹھنی کے لیے کوئی سرور اپنی زندگی نہ گنوا دے۔ ایسا سماج ایسی صورت میں ترتیب دیا جا سکتا ہے جب سماج میں موجود طبقاتی کشمکش کو ختم کر دیا اور انسانیت سے محبت اور انسانیت کی قدر کی جائے۔

سماج میں طبقاتی کشمکش کے حوالے سے اشفاق احمد کا ایک اور افسانہ ''مسرور مرثیہ'' ہے جس میں انہوں نے محنت کش طبقے کی حق تلفی دکھائی ہے۔ اس افسانے میں اشفاق احمد نے سماج میں ہاتھ سے کام کرنے والے محنت کشوں اور کاریگروں کی حق تلفی کا رونا رویا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح وقت کے ایک خاص نقطے پر ذہنی کام کرنے والے یعنی اعلیٰ طبقے کے لوگ ہاتھ سے کام کرنے والے سادہ لوح لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر انہیں سماج کے نچلے طبقے میں دھکیل دیتے ہیں اور مزہ یہ کہ وہ محنت کشوں کی شان میں لفظی قصیدے سنا سنا کر انہیں معاشرتی رسوائی کا احساس بھی ہونے دیتے۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> راج پاٹھ بول بھاشن والوں کے لیے ہوگا اور گیت سلامیاں راج مستری کے لیے ہوں گی۔ تخت اور تاج علم والوں کے پاس رہے گا جبکہ شاعری شاباشی ہنرمندوں، محنت کشوں کے لیے ہوگی، بادشاہی اور حکمرانی بے ہنر اور بے محنت، بے تعلق، بے اعتبار گفتگو بازوں اور بھوکے اپدیشکوں کے پاس رہے گی جبکہ تھاپی تھاپڑا کسان کاشت کار کے لیے ہوگا، رائل فیملی ذکر اذکار اور باتیں کرنے والوں کی ہوگی اور پچکار چمکار کی رائلٹی ہنرمندوں کو ملے گی۔ (۴۸)

اشفاق احمد اس افسانے میں بتاتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں کوئی ہنر نہیں ہوتا پھر بھی وہ عیش کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس ہنرمند اور محنت کش گھاٹے میں رہ جاتے ہیں۔ یہ سب سماج میں طبقاتی کشمکش کا نتیجہ ہے۔

اشفاق احمد نے کافی افسانوں میں سماج میں طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے کا درس دیا ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' میں بھی ان امیر کبیر چوہدروں پر طنز کیا ہے جو غریب اور کمزور لوگوں کے حقوق اور زمینوں پر ناجائز قبضہ کرتے ہیں اور سماج میں اپنے اختیارات و تعلقات اور مال و دولت کے بل بوتے پر عدالتوں سے بھی من پسند فیصلے صادر کراتے ہیں۔

ماسٹر عبدالودود کی تین کنال، گیارہ مرلے، چھ سرساہی زمین مع ڈھائی کنال زمین شاملات تھی۔ یہ زمین اس کے دادا کے زمانے سے اسی طرح چلی آ رہی تھی۔ یہ سب کی آرزو تھی کہ اس میں اپنے لیے پکا گھر بنائے لیکن ماسٹر عبدالودود نہ بنا سکا تو اس نے اپنے بیٹے شاہ مراد سے کہا کہ وہ بڑا ہو کر اس موروثی زمین پر ایک گھر ضرور بنائے لیکن ماسٹر عبدالودود کے ساتھ اچانک حادثہ ہوا۔ چوہدری غضنفر ماسٹر عبدالودود کی آبائی زمین پر قابض ہو گئے اور اپنے جانوروں کے لیے کچا طویلہ تعمیر کر لیا۔

چوہدری صاحب کی مخالف پارٹی ''نور بگے گجر'' نے ماسٹر عبدالودود سے چوہدری غضنفر پر مقدمہ کروا دیا اور ڈیڑھ سال بعد ماسٹر عبدالودود مقدمہ ہار گیا۔ پھر ماسٹر عبدالودود اینڈ پارٹی نے سیشن کورٹ میں اپیل کر دی اور ماسٹر عبدالودود تقریباً تین سال سیشن کورٹ میں پھنسا رہا اور آخر کار تنگ آ کر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ:

جناب میں اس زمین سے دست بردار ہوتا ہوں اور بھری عدالت میں حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میرا اس نام نہاد موروثی زمین سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تحریری طور پر عدالت کی خدمت اقدس میں عرض کرتا ہوں کہ یہ زمین چودھری غضنفر صاحب کی ہے اور اگر اب تک ان کی نہیں تھی تو اب ہوئی ، ہمیشہ کے لیے ہوئی اور ان کے خاندان کی جائیداد کا ایک جائز حصہ ٹھہری۔ مبارک ہو! (۴۹)

دراصل اشفاق احمد یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سماج میں امیر کبیر لوگ کس طرح غریبوں، کمزوروں اور بے بس لوگوں کی حق اور ملکیت پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور معاشرے میں کس طرح ان کی غربت وافلاس کا مذاق اڑاتے ہیں اور ان امیروں اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے ہاتھوں نچلے طبقے کے لوگ کس طرح کھلونا بن کر زندگی بسر کرتے ہیں ۔ اشفاق احمد سماج میں طبقاتی جبر کے سخت خلاف ہیں اس لیے انہوں نے اپنے نظریات کھلے طور پر اپنے افسانوں میں بیان کیے ہیں۔

دھرتی سے محبت، اپنے ملک وسرزمین سے قلبی لگاؤ اور دیرینہ تعلق فطری امر ہے۔ جس طرح والدین، بھائی بہن اور بچوں کی محبت فطری اور طبعی ہوتی ہے، اسی طرح دھرتی کی محبت بلا تکلف ہوا کرتی ہے۔ جس سرزمین پر انسان جنم لیتا ہے، نشو ونما پاتا ہے، عنفوان شباب کو پہنچتا ہے۔ شادی بیاہ کرتا ہے، ملازمت، مزدوری وتجارت کرتا ہے اس کی یادیں کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کو وہ کبھی بھلا نہیں سکتا۔ وہ کیسے فراموش کر سکتا ہے اس دھرتی کو جس میں وہ اپنے آبا واجداد، والدین، بہن بھائیوں، رشتہ داروں اور دوست واحبات کے ساتھ رہائش پذیر رہا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے قران پاک میں اپنی جان کی محبت کے ساتھ اپنی دھرتی سے محبت وتعلق کو ظاہر کرتے ہوئے سورۃ النساء میں فرمایا ہے:

ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم م فعلوہ الا قلیل منھم۔ط

ترجمہ: اور اگر ہم ان پر لکھ دیتے کہ تم اپنے آپ کو قتل کر لو اور اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو وہ ہرگز نہ کرتے سوائے معدود چند افراد کے۔ (۵۰)

اللہ تعالیٰ نے قران پاک میں وطن سے محبت بیان فرمایا کہ یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور جگہ قران مجید میں وطن کی محبت کو دین ومذہب سے جوڑ کر بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلو کم فی الدین و اخرجو کم من دیار کم۔

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف سے منع نہیں کیا، جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہ کی اور تم کو تمہارے گھروں سے نہ نکالا ہو۔(۵۱)

دھرتی سے محبت ایک فطری جذبہ ہے جو اپنے علاقے، گھر، خاندان، قبیلے اور محلے کے حدود سے شروع ہو کر ملکی اور قومی حدود پر ختم ہوتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی علاقے میں اگر بندہ چلا جائے تو اپنے ملک سے وابستگی، محبت اور جذبات کا اظہار عام آدمی کی گفتگو میں ملے گا۔ اپنی سرزمین سے محبت اور وفاداری کا اظہار ہر کوئی کرتا ہے خواہ وہ چند سکے کما کر گھر آئے یا ہزاروں روپے تعیش میں اڑائے، اس کی محبت اور وفاداری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

دنیا کے کسی بھی کونے میں قومیں بحیثیت قوم اپنی دھرتی سے برگشتہ نہیں ہوتیں انہیں اپنی مٹی، اپنے ابا و اجداد کے گھروں اور ان کی قبروں سے محبت و عقیدت ہوتی ہے لیکن حکومتوں کے افعال اور پالیسیاں ان میں موجود محبت کے ضمیر کو کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ دنیا میں وفاداری اور محبتوں کی کسوٹی کو اگر دیکھا جائے تو تحفظ، سکون اور اطمینان سے اس کا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ والدین اور گھر کی وفاداری و محبت اس تحفظ سے جنم لیتی ہے جو بچپن سے جوانی تک ایک بچے کو میسر آیا ہوتا ہے۔ اس کی بیماری، تعلیم و تربیت اور اس کے مسائل و مشکلات میں جس ماں باپ نے جتنا اس کا ساتھ دیا ہوتا ہے اتنی ہی وفاداری و محبت اس کی خمیر میں آتی ہے۔

اشفاق احمد نے بھی دوسرے ادیبوں کی طرح اپنی تحریروں اور تقریروں میں دھرتی سے محبت کو جوش و جذبے کے ساتھ بیان کیا ہیں۔ انہیں اپنی سرزمین اپنے جسم سے بھی پیاری ہے وہ اپنے وطن سے محبت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہم اپنی دولت، شہرت، عزت، شفقت، محبت، مروت یہ سب کچھ لے کر اپنے وطن کی بنیادوں میں ڈالنا چاہتے تھے، لیکن ہمارے پاس سوائے ہمارے بدنوں کے، ہمارے وجود کے اور سوائے ہمارے اپنے خون کے کچھ بھی نہ تھا۔ ہم نے اپنے وجود کو، اپنے جسم کو، اپنے خون کو اس وطن کی بنیادوں کو پیش کیا۔ جو الحمدللہ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا اور یوں اس ملک کی بنیاد پڑی۔(۵۲)

اشفاق احمد کو اپنی دھرتی کے ہر ایک چپے سے، ہر ایک کونے سے ہر ایک ذرے سے محبت تھی، انہوں نے اسی محبت کا اظہار دوسری تحریروں کی طرح اپنے افسانون میں بھی بیان کیا ہے۔ سرزمین وطن سے محبت کے حوالے سے ان کا ایک خوبصورت افسانہ ''چاند کا سفر'' ہے۔ جو کہ گورنمنٹ کالج سے محبت کی کہانی ہے۔ گورنمنٹ کالج سے

محبت کا سبب ان کا وطن عزیز سے محبت کی عکاسی کرتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اہلیہ بانو قدسیہ کے ساتھ طویل عرصے کے بعد گورنمنٹ کالج میں چلے جاتے ہیں تو ان کو گورنمنٹ کالج سے وابستہ ماضی کی بہترین اور خوشگوار یادیں ستانے لگتی ہیں۔ ان کا واپس جانے کو دل نہیں چاہتا کیونکہ وہ گورنمنٹ کالج کو درس گاہ نہیں بلکہ اپنی درگاہ مانتے ہیں۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ:

> ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں چابیوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہماری طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا ''کون لوگ ہو تم؟ میں نے کہا ''ہم لوگ ہیں'' اس نے کہا یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے'' میں نے کہا'' کس کا حکم نہیں ؟ پرنسپل صاحب کا'' اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ (۵۳)

اشفاق احمد کو سرزمین وطن سے بے حد محبت تھی۔ وہ اسی محبت کو جس انداز سے بیان کرتے ہیں اس کو پڑھتے ہوئے قاری کے ذہن میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی افسانے میں جب وہ گورنمنٹ کالج سے زبردستی نکالے جاتے ہیں تو وہ اتنی مسحور کن انداز میں محبت کو بیان کرتے ہیں کہ قاری کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ابھرنے لگتا ہے اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ واپسی کی روداد ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> بانو نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستگی سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے موڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے، کئی بے ہودہ، نکمے، بدہیت اور بے کار لوگ درگاہوں سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش دھلا دیئے جاتے ہیں۔۔۔ لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگاہوں کی مورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔ (۵۴)

اشفاق احمد واپسی کا سفر گورنمنٹ کالج کی طرف سفر قرار دیتے ہیں ان کا مقصد ہے کہ جب (Space shuttle) زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا لیکن پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور منزل مقصود چاند ہی ہوتی ہے۔

ایک بڑے ادیب بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو اپنے وطن کی سرزمین کے ایک ایک چپے کی واقفیت ہوں، لوگوں کے رہن سہن، تہذیب و تمدن اور معاشرت سے مکمل آگاہی ہوں تب کہیں جا کر وہ ایک بڑا تخلیق کار بن سکتا ہے، وہ محبِ وطن بن سکتا ہے اور یہ تمام خوبیاں اشفاق احمد میں موجود تھیں۔

رومانویت سے وابستہ ہر ادیب اپنی تحریر وتقریر میں سماج میں رومانوی جذبات واحساسات کی عکاسی کرتا ہے شاعر اور نثر نگار دونوں سماج کے اندر محبت کے مختلف پہلوؤں کو کچھ اس رنگ سے بھر دیتے ہیں کہ قاری کے قلب و ذہن کو متاثر ہوئے بغیر نہیں چھوڑتا بلکہ قاری ہر کردار کو اپنے اندر جیتا جاگتا محسوس کرتا ہے۔اس سلسلے میں شاعر علی شاعر اپنی کتاب نیا اردو افسانہ میں لکھتے ہیں:

> اردو ادب میں جذبات کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور احساس کے وجود نے حساس طبع کو بھی زیادہ نمایاں کیا ہے۔یہ بات بھی سچ ہے کہ جذبات میں رومانیت کا عنصر ہو تو جذبات زیادہ جاندار ہوتے ہیں۔اس لیے کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے ہونے، جس کے وجود سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کرسکتا اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے اردو ادب میں تخلیق کاروں کی شاعری اور نثر دونوں میں ایک ایسی سوچ کا رنگ بھرا، جس نے پڑھنے والوں کے قلب وذہن پر اپنا اثر اسی طرح قائم کیا کہ پڑھنے والوں نے ہر کردار کو اپنے اندر جیتا جاگتا محسوس کیا۔ان کرداروں کے احساس کو اپنے ماحول میں محسوس کیا اور اس کا احساس کیوں ہوتا تھا۔؟اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے والوں نے جیتے جاگتے لوگوں کو ایسے رنگ میں اپنے ہنر وفن سے الفاظ کو ڈبویا کہ وہ چمک چمک کر اپنے ہونے کا پتہ دینے لگے۔(۵۵)

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں سماج میں رومانوی جذبات واحساسات کی عکاسی نہایت خوبصورت انداز میں بیان کی ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں مرد اور عورت دونوں کے دلی جذبات واحساسات کا ذکر کیا ہیں مثلاً افسانہ ''شب خون'' میں ''بیٹرس'' کے داخلی جذبات واحساسات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> بیٹرس کو عشق عباس سے ہی ہوا لیکن پیار سب سے زیادہ شقو پر آیا۔اگر شقو صحت یاب ہو جائے ،اس نے سوچا تو کتنا اچھا ہو۔میں اسے کبھی گھر واپس نہ جانے دوں۔وہ لوگ تو ناامید ہو چکے ہیں اور اب انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں۔اگر ہوتی تو سالمی میں کئی بیڈ خالی تھے، کوئی ریزرو کروالیا ہوتا۔۔۔شقو عمر بھر میرے پاس رہے۔(۵۶)

گویا بیٹرس کے دل میں شقو کے ساتھ جو محبت تھی اور جس قدر وہ شقو کو چاہتی تھی۔اشفاق احمد نے ایک ماہر نباض کی طرح اس کی ترجمانی کی ہیں کیونکہ بیٹرس جو کچھ شقو کے بارے میں سوچتی ہے وہ محض اس کے دل کے اندر رہتی ہے۔الفاظ کے ذریعے شقو سے محبت کی شدت کو باقی لوگوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔

اسی طرح افسانہ ''رات بیت رہی ہے'' خط کے انداز میں تحریر کیا گیا ایک منفرد افسانہ ہے۔اس افسانے میں بھی اشفاق احمد نے سماج میں رومانوی جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کی ہیں۔اس افسانے میں دو جوڑے

آپس میں محبت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ایک جوڑا ایک ہواباز جس نے اپنے لیے واحد متکلم ''میں'' کا استعمال کیا ہے اور اس کی محبوبہ ''رینا'' ہے دوسرا جوڑا امریکی پائلٹ ''پیٹر'' اور پیٹر کی محبوبہ ''مارگریٹ'' ہیں۔

پہلے جوڑے میں ہواباز کی اپنی محبوبہ ''رینا'' سے سچی محبت ہے۔اسی لیے تو اس نے اپنی آرزوؤں کی گھڑی اپنی محبوبہ کے قدموں میں لاکر رکھ دی ہے اور یوں اس کی رضا اور مرضی پوری طور پر ختم ہوتی نظر آتی ہے اس کا الف ۔اے میں داخلہ ہو یا خدا کے وجود کا ماننا محض ''رینا'' سے مشروط ہے ''رینا'' جو کچھ چاہتی ہے وہ ویسا ہی کرتا ہے، گویا اشفاق احمد نے ''ہواباز'' اور ''رینا'' دونوں کی داخلی اور خارجی جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہیں۔

اسی طرح دوسرے جوڑے کی محبت کی کہانی بھی تسلسل سے بہہ رہی ہے۔اس میں امریکی پائلٹ ''پیٹر'' چونکہ اپنی محبوبہ ''مارگریٹ'' سے شدید محبت کرتا ہے۔اس لیے اس کے کہنے پر وہ فوج میں بھرتی ہوکر اپنی محبوبہ کی دلی خواہش پوری کرتا ہے۔سماج میں عام نوجوان عاشقوں کی طرح ''پیٹر'' بھی اپنی محبوبہ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے دلی سرور محسوس کرتا ہے اور مارگریٹ کے ذکر سے اس کا جی نہیں بھرتا۔مارگریٹ سے اس کی شدید محبت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ موت سے پہلے اپنی آخری سانسوں میں وہ اس کی تصویر دیکھنا چاہتا ہے اور اس طرح اپنی محبوبہ کی تصویر دیکھنے کے بعد اس کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہوجاتی ہیں۔اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> ذرا میرا البم تو لاؤ۔ہارلو میرے پاس کھڑا تھا۔میں نے اسے کہا اور جب وہ لے آیا تو پیٹر نے کہا ''آخری تصویر نکالو'' میں نے مارگریٹ کی وہی تصویر نکالی۔پیٹر نے اسے اپنی دھندلی نگاہوں سے دیکھا اور بولا ''اسے میرے قریب تو کرو'' اور جب میں ے اسے قریب کیا تو بولا ''ذرا اور نزدیک'' اس کے بعد اس نے کہا ''مارگریٹ نے مجھے کہا تھا کہ مرد فوج میں بھرتی ہونے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔دیکھو میری ٹوپی پہن کر یہ کس قدر خوش نظر آتی ہے۔۔۔۔یہ اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تم وردی پہن کر میرے ساتھ پرنسٹن کی گلیوں میں چلا کروگے تو ہر بری اور بحری فوج ہمیں سلام کیا کرے گا، کاش اس کی یہ آرزو پوری ہوسکتی۔(۵۷)

اشفاق احمد سماج کے اندر رہتے ہوئے مرد اور عورت کے ذہنی کیفیات سے پوری طرح آگاہ تھے اور مرد وعورت کی نفسیات سے بخوبی واقفیت رکھنے والے افسانہ نگار تھے۔اس لیے انہوں نے ''سنگ دل، عجیب بادشاہ ،تو تا کہانی ،بابا، امی ،رات بیت رہی ہے اور شب خون'' جیسے افسانوں میں معاشرے میں رومانوی جذبات واحساسات کی بھرپور عکاسی کی ہیں جو کہ پڑھنے والوں پر ایک مثبت تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔

(ج) معاشرتی مسائل کا اظہار

ہر ادیب کی نظریں سماج میں ہونے والے حالات پر ہوتی ہیں۔ وہ معاشرے میں ہونے والی منفی و مثبت دونوں پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور اسی طرح ہر اچھا ادیب سماج کی خوبیوں اور خامیوں کو تحریر کرتا ہے خوبیوں کی مزید اشاعت و ترویج میں کوشاں رہتا ہے جبکہ خامیوں، برائیوں اور مسائل کے خاتمے میں لگا رہتا ہے۔ ادیب ادب کے ذریعے سماجی صداقتیں معاشرے میں بسنے والے لوگوں پر آشکارا کرتا ہے۔ وہ سب کچھ بغیر کسی صلے کے کرتا رہتا ہے کیونکہ ادیب کے اندر معاشرے میں رہنے والے لوگوں کا احساس ہوتا ہے، اس کے اندر لوگوں کے دکھ درد کی تڑپ موجود ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم لکھتی ہیں کہ:

> ادب معاشرے کے خواب کی تعبیر ہوتا ہے، خواب کتنا ہی بھیانک کیوں نہ ہو، خواب دیکھنے والا اس کی تعبیر خوشگوار چاہتا ہے، اجتماعی فکر کے حامی اپنے ادب میں صرف خواب ہی دہراتے ہیں اس کی تعبیر بھی تراشتے ہیں۔ بعض اوقات یہ صداقتیں اتنی تلخ ہوتی ہے کہ لوگ خود ان کو دیکھنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتے۔ تاہم اچھا ادیب سچ بتاتا ہے اسے صلے کی پروا کیا ہوتی ہے۔ (۵۸)

گویا ادب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے ہم زندگی کے پیچیدہ مسائل بیان کر کے ان کا حل پیش کر سکتے ہیں کیونکہ ادب ہی انسان کی تمام ضرورتوں، مسائل اور ان سے نجات کا باعث بن سکتا ہے۔ انسان کے ہر پیچیدہ جذبے اور گنجلک خیال کو ادب سہل انداز میں عمدہ اور دلپذیر طریقے سے بیان کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ جس سے انسان دوستی کی فضا قائم ہوتی ہے اور سماج میں محبت و پیار کی فضا پنپتی ہے اس کے متعلق ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں ''ادب کا پیغام محبت ہے اور محبت ہی وہ جذبہ ہے جو انسانوں میں یگانگت پیدا کرتا ہے اور اسی سے معاشرے میں امن قائم ہوتا ہے ادب انسان میں بلند ہمتی اور بلند حوصلگی پیدا کرتا ہے۔'' (۵۹)

اشفاق احمد نے تحریر و تقریر دونوں میں زندگی کے حقائق اور معاشرتی مسائل پر بحث کی ہے۔ انہوں نے ٹی وی ڈرامے، ریڈیو پروگرامز، افسانوں اور دوسری تحریروں میں معاشرتی مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل تلاش کیے ہیں۔ ان کے ٹی وی ڈراموں میں زندگی کے حقائق اور معاشرتی مسائل پر بحث کے حوالے سے محمد سلمان بھٹی اپنے مضمون ''اشفاق احمد صاحب پی ٹی وی ڈرامہ اور سماجی حقیقی'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> محمد نثار حسین نے اشفاق احمد سے ''نور باف'' کے عنوان سے کہانی لکھوائی جو تیار بھی ہوئی اور نشر بھی۔ یہ تجربہ اتنا کامیاب تو نہ تھا لیکن اشفاق احمد صاحب کے اس کھیل نے آنے والے عہد میں پی ٹی وی ڈرامے کو ایک نئی جہت سے روشناس کروا دیا۔ اشفاق احمد نے جو کھیل تحریر کیے وہ معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنے معاشرتی مسائل کو محسوس کرنے اور ان مسائل کے حل کی جانب

توجہ مبذول کروانے کی خاطر تحریر کیے وہ اپنے کھیلوں میں محض تفریح کے قائل نہیں بلکہ معاشرتی اصلاح اور نفس کی صفائی کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔(۶۰)

اشفاق احمد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک افسانہ نگار تھے۔انہوں نے محبت کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود مختلف قسم کے مسائل اور الجھنوں کا ذکر بھی بیان کیا ہے۔معاشرے کے اندر بڑھتی ہوئی منافقانہ سوچ اور انفرادی رویوں کے خلاف بھی انہوں نے اپنے افسانوں میں آواز بلند کی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں نہ صرف معاشرتی مسائل کی نشاندہی کی ہے بلکہ اس کے حل کے لیے بھی تجاویز پیش کی ہیں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں معاشرتی مسائل کا اظہار خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔اپنے افسانے ''پھمن کہانی'' میں معاشرتی مسائل کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔اس افسانے میں سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ غریب کی بے کس و مجبور زندگی کے کئی رخ دکھائے ہیں جب پھمن کا ابا چوہدری کے پیسے واپس نہیں کر پاتا تو چوہدری جو برتاؤ اس کے ساتھ کرتا ہے، وہ کچھ یوں ہے:

> اس دن چوہدریاں نے میرے ابے کو چوکی بھیج کر میرے ابے کی چھترول کرائی تھی، اس کے ناک منہ سے لہو نکلا تھا تو حوالدار نے پوچھا تھا۔''چوہدری صاحب کے باقی تین سو کداں دے گا'' تو میرے ابے نے آکھیا تھا''میرے گھر کوئی پیسہ نئیں ناں ای کوئی ٹوم چھلا اے۔جھوٹی وچ کے میں ادھے پیسے اتار چھڈے تھے باقی کے وی اتار دیاں گا، میری جان بخشی کرا دیؤ'' حوالدار نے میرے ابے تے تین روپے لے کر دس دن کی معافی دے دی تھی۔(۶۱)

درج بالا اقتباس میں غریب کی مجبوری بھی ہے، جاگیردار کا ظلم و ستم بھی اور رشوت کا استعمال بھی ہے۔جو موجودہ سماج کی سچی تصویریں ہیں۔آج بھی غریب اور مفلس ایسی زندگی گزار رہا ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے اور نہ ہی اس کی زندگی بدلنے کی کوئی امید دکھائی دے رہی ہے۔سماج کا یہ حال ہے کہ غریب اپنی زندگی میں پریشان حال رہتا ہے اور مرنے کے بعد کفن بھی نصیب نہیں ہوتا۔غریب کا وجود زمین پر ایک اضافی شے کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔اشفاق احمد ان حالات کو بیان کر کے موجودہ سماج سے ان عناصر کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

معاشرتی مسائل اور ان کی وجوہات کے حوالے سے ان کا افسانہ ''امی'' ایک حقیقت پسندانہ افسانہ ہے۔جس میں انہوں نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ جن بچوں کے ماں باپ دوسری شادی کر لیتے ہیں ان کو کن مسائل اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی ذہنی و جسمانی نشوونما کس حد تک متاثر ہوتی ہے اور اسی طرح اس کے بعد اشفاق احمد کے مطابق ''مسعود'' جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصنف اس حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں کہ پرائے بچے کبھی اپنے نہیں ہوسکتے۔اس لیے جب چچا کا اپنا بیٹا ''مسعود'' کی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا

ہے تو اسے باپ کی پوری توجہ اور محبت میسر ہوتی ہے جبکہ مسعود کو سرے سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے اشفاق احمد لکھتے ہیں:

> خوف، نفرت اور تشکر کے ملے جلے جذبات سے مسعود کی آنکھیں پھٹتیں، بند ہوتیں اور پھر اصلی حالت پر آ جاتیں اور وہ نوٹ مٹھی میں دبا کر ماں کو بتانے دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتا اور اس کا چچا اپنے کمرے میں حقہ بجاتے ہوئے ہانک لگاتا ''فیس دے دی ہے جی تمہارے شہزادے کو۔ ڈپٹی صاحب کو!'' یہ سنتے ہی مسعود ایک دم رک جاتا اور جی ہی جی میں اپنی ماں کو ایک گندی سی گالی دے کر وہ الٹے پاؤں اپنی کوٹھڑی میں جا کر بستہ باندھنے لگتا۔ چچا جیسے بیہودہ آدمی سے شادی کر کے اس کی ماں اس کی نگاہوں میں بالکل گر چکی تھی اور وہ چچا کی طعن آمیز باتوں کا بدلہ ہمیشہ اپنی ماں کو گالی دے کر چکایا کرتا۔ (۶۲)

اشفاق احمد افسانہ ''امی'' میں یہ بات بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ معاشرے میں اگر عورت بیوہ ہو جائے تو اسے دوسری شادی کی ضرورت نہیں بلکہ دوسری شادی کے بغیر بھی عورت اپنے بچوں کی مکمل اور کامیاب پرورش کر سکتی ہے اور اپنے بچوں کا مستقبل سنوار سکتی ہے۔ اگر مسعود کی ماں بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی نہ کرتی تو مسعود کی یہ حالت نہ ہوتی جو آخر کار جوئے کی لعنت اور غلط اٹھک بیٹھک کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

اشفاق احمد زندگی کے حقائق اور سماجی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ ان کے حل بھی پیش کرتے جاتے ہیں چنانچہ وہ ''بانسری'' میں لکھتے ہیں:

> اگر میرے بچے اپنے خیالات کو مثبت انداز میں ڈھالیں اور خودکشی اور قتل کرنے والی رائفل کو بانسری میں تبدیل کر دیں تو وہ بہت سی مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔ ان کی یہ گھبراہٹ انفارمیشن ملنے کی وجہ سے ہے۔ میرے بچے روانڈا کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں اور اپنے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اپنی ذات کا مطالعہ کرنا بہت ضروری ہے۔ جس طرح سے کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے اللہ کو پہچان لیا اس لیے خود کی پہچان کرنا بہت ضروری ہے (۶۳)۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانے میں بعض غلط روایات کو بھی معاشرتی مسائل کے زمرے میں شامل کیا ہے کیونکہ باپ دادا کی بعض روایات ایسی ہیں جنہیں اپنانے سے معاشرے میں مختلف قسم کے مسائل جنم لیتے ہیں۔ اشفاق احمد نے افسانہ ''اٹوٹ مان'' میں پرندوں اور جانوروں کی زبان سے ان غلط روایات کو سماجی مسائل کا پیش خیمہ ثابت کیا ہے اس افسانے میں اشفاق احمد بیان کرتے ہیں کہ معاشرے میں انسان خود پسندی اور نرگسیت کی وجہ

سے ذہنی امراض کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا رویہ سماج میں مسائل اور برائیوں کا باعث بنتا ہے اور کبھی کبھار علم و حکمت اور تعلیم کے باوجود ہم باپ دادا کی غلط روایات کو اپنا کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ اشفاق احمد ان منفی رویوں پر سختی سے سرزنش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> پیرو نے کہا ''یہ کیسی غیر قدرتی بات ہے کیسا مصنوعی فعل ہے۔ افسوس کہ یہ سب نرگیست کا کیا دھرا ہے ورنہ تمہارے جیسا نر جانور یوں سکرٹ نہ پہنے پھرتا'' مور غمناک لہجے میں بولا ''بس بزرگوں کے وقت سے یہی ریت چلی آئی ہے۔ میں تو خود اس کے خلاف ہوں لیکن کیا کیا جائے بوڑھے مور نہیں مانتے اور کم بخت بزرگوں کے سامنے دال نہیں گلتی۔'' پیرو نے کہا ''اب تو سب بوڑھے دفان ہو گئے اب تو تمہارا اپنا اختیار ہے'' مور نے خوش ہو کر کہا'' لیجے یہ بات تو میرے دھیان ہی میں نہ آئی تھی۔ اچھا کیا آپ نے یاد دلایا۔ (۶۴)

اشفاق احمد ان تمام عناصر کی جو سماج کے لیے نقصان دہ ہیں اور جن سے معاشرتی مسائل پیدا ہوتے ہیں نفی کرتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کا انسان اپنی انسانیت کے درجات اور معیار کو بھول چکا ہے اور جانوروں سے بھی نچلی سطح پر پہنچ چکا ہے۔ اس لیے ضرورت خود احتسابی کی ہے جب تک اپنے اپ کی اصلاح نہیں کریں گے۔ معاشرے میں بوسیدہ اور گھٹیا روایات پر چلنے کی بجائے ان کا خاتمہ نہیں کیا جائے گا، تبدیلی نہیں آئے گی۔

اشفاق احمد جدید دور کے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے پہلے دور کے افسانوں میں مجازی محبت کی جھلک صاف نظر آ رہی ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ایک محبت سو افسانے اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں محبت کا آغاز بھی مجاز سے کیا۔ مجازی محبت اور حقیقی محبت کے بارے میں اشفاق احمد کی رائے زاویہ سوئم میں یوں ہیں:

> اپنی انا اور نفس کو ایک انسان کے سامنے پامال کرنے کا نام عشق مجازی ہے اور اپنی انا اور نفس کو سب کے سامنے پامال کرنے کا نام عشق حقیقی ہے۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ عشق حقیقی ایک درخت ہے اور عشق مجازی اس کی شاخ ہے۔ جب انسان کا عشق لا حاصل رہتا ہے تو وہ دریا کو چھوڑ کر سمندر کا پیاسا بن جاتا ہے، چھوٹے راستے سے ہٹ کر بڑے مدار کا مسافر بن جاتا ہے۔ تب اس کی طلب، اس کی ترجیحات بدل جاتیں ہیں۔ (۶۵)

اشفاق احمد نے باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۲ء میں افسانہ ''جعفری'' لکھ کر کیا۔ یہ افسانہ اشفاق احمد نے رسالہ ''ساقی'' کو بھجوایا لیکن ناقابل اشاعت ہونے کی بنا پر واپس کر دیا گیا۔ پھر بھی اشفاق احمد نا امید نہ ہوئے اور

انہوں نے یہی افسانہ ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدین کو بھیج دیا۔ان کے ہاں اسے نہ محض قابل اشاعت سمجھا گیا بلکہ بے حد سراہا بھی گیا۔ چنانچہ یہ افسانہ ۱۹۴۲ء میں رسالہ ادبی دنیا'' میں شائع ہوا لیکن مدیر نے اس کا نام تبدیل کر کے ''توبہ'' کے نام سے چھاپا۔ یہ اشفاق احمد کی ادبی زندگی کا آغاز تھا۔ یہی افسانہ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''ایک محبت سو افسانے'' میں شامل ہے۔ یہ افسانہ ایک سگریٹ نوش کی کہانی ہے جسے اپنے والدین کی ڈانٹ ڈپٹ اور انعامات تو اس لعنت سے نجات نہ دلوا سکے لیکن ایک لڑکی کی معصوم محبت نے یہ کمال کر دکھایا۔ یہ ''اعجاز'' اور ''لیکھا'' کی مجازی محبت پر مبنی کہانی ہے گویا اشفاق احمد نے افسانوں کی ابتداء ہی مجازی محبت سے کی۔

اشفاق احمد کے افسانوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی محبت مجاز سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ حقیقت کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ اس سلسلے میں لالہ رُخ خان لکھتی ہے کہ:

> اردو افسانہ نگاروں میں اشفاق احمد ایسا نام ہے جس نے افسانے کا موضوع محبت اور اس کی کیفیات کو بنایا۔ اس کی محبت عام محبت نہیں بلکہ بڑی خاص گہری اور داخلی محبت ہے جو مجاز سے سفر کرتے ہوئے حقیقت کی طرف مڑ جاتی ہے۔ اشفاق احمد کی محبت کے لاتعداد روپ میں جو لڑکے اور لڑکی تک محدود نہیں بلکہ اپنا وجود پھیلائے ہوئے وسیع کائنات میں پھیل جاتے ہیں۔(۶۶)

اشفاق احمد درحقیقت ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں رومان اور حقیقت کی آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ اگر فکری نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی کہانیوں کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ محبت کے سب رنگ اپنی خوبصورتیوں اور جولانیوں کے ساتھ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں محبت ایک عظیم کائناتی سچائی کی شکل میں ابھرتی ہے اور یہ محبت مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرتی ہے۔ تصوف جو آگے چل کر ان کے افسانوں اور ٹی وی پروگراموں اور ڈراموں کا بنیادی موضوع بنا۔ اس کے پہلے مجموعے ایک محبت سو افسانے میں حقیقی محبت کے ابتدائی خدوخال نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے محض انسانوں سے ہی نہیں بلکہ تمام مخلوق خدا سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت ایک بڑی سچائی کی صورت میں دکھائی دے رہی ہے اور مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کرتی ہے۔ مثلاً افسانہ ''توبہ'' اعجاز اور لیکھا کی محبت کی کہانی ''رات بیت رہی ہے'' پائلٹ اور اس کی محبوبہ کی رومانوی داستان کی یاد جبکہ افسانہ ''شب خون'' شقو اور بیٹرس کی روداد ہے۔ اسی طرح ''توتا کہانی'' میں خوبصورت رومانوی جذبات اور احساسات کی عکاسی کرتے ہوئے ''حامد'' اور ''خجستہ'' کی محبت کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جبکہ افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں ''زمان''، اس کے بیٹے اور بیوی کے درمیان ایک ان مٹ رشتے کی کہانی ہے۔

افسانہ ''رات بیت رہی ہے'' میں اشفاق احمد نے روحانی محبت کی تصویر کشی کی ہے۔اپنی خواہشات اور مرضی کو محبوب کے سامنے تج دینا ہی اصل محبت ہے۔اس کہانی میں ہیرو نے اپنی خواہشات اور مرضی کو اپنی محبوبہ کے سامنے قربان کر دیا ہے۔وہ بی۔اے میں داخلہ لینا نہیں چاہتا، وہ خود پائلٹ بننا نہیں چاہتا لیکن اپنی محبوبہ کی خاطر اور محبوبہ کی مرضی کو ترجیح دے کر غیر ارادی طور پر سب کچھ کر رہا ہے۔آخر میں جب ہیرو کا اعتقاد خدا کی ذات سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی ذات سے منکر ہو جاتا ہے تو اپنی محبوبہ کی ایک دھمکی کے بعد اسے دنیا جہاں کی ہر شے میں اللہ تعالیٰ کا ظہور آنا شروع ہو جاتا ہے۔

اسی طرح افسانہ ''فہیم'' میں اشفاق احمد یہ احساس دلاتا ہے کہ جو لوگ خداوند تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے بھی محبت کرتے ہیں اور یہی لوگ زندگی میں کامیاب و کامران ہیں کیونکہ ان کا بھروسا محض اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔''نانا'' کی پوری زندگی لوگوں کے لیے ایک بہت بڑی مثال ہے۔''نانا'' ایک ایسا انسان ہے جو دوسروں میں آرام اور سکھ بانٹ دیتا ہے اور کبھی بھی اپنے لیے کچھ نہیں رکھتا۔اسے جو کچھ مل جاتا ہے فی سبیل اللہ صرف کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل اور یقین رکھتا ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ اشفاق احمد نے اپنے سفر کا آغاز مجاز سے کیا اور آہستہ آہستہ یہ سفر حقیقت کی طرف گامزن ہوتی دکھائی دے رہا ہے۔

حوالہ جات

(۱) شعیب عتیق خان، ڈاکٹر، اردو افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ء کے اثرات، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲

(۲) حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۸۱

(۳) رشمی چودھری، مختصر اردو لغت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۸۸۸

(۴) شاذیہ افتخار خان، اردو انسائیکلو پیڈیا، فیروز سنز، لاہور، چوتھا ایڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۸

(۵) Bryans Turners "The cambridge Dictionary of sociology"Cambridge University press ,2006,pg 592

(۶) "The Blackwell Dictionary of twentieth CenturySocial thought "Uk Blackwell Publishers,1993,pg.202

(۷) "Oxford Dictionary of Sociology "3rd .2005 ,pg 622

(۸) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۳۰

(۹) سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۴۵۹

(۱۰) رشید احمد، پروفیسر، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۸

(۱۱) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، ص ۳۱

(۱۲) وزیر آغا، ڈاکٹر، تخلیقی عمل مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۲۴

(۱۳) شمیم حسین قادری، سید، اسلامی ریاست ۔قران کی روشنی میں، شعبہ مطبوعات محکمہ اوقاف، لاہور، جون ۱۹۸۴ء، ص ۲۸

(۱۴) تجمل حسین ہاشمی، ہمارا معاشرہ، ابلاغ پبلشرز اردو بازار، لاہور، جنوری ۲۰۰۱ء، ص ۲۲

(۱۵) خورشید احمد، اسلامی نظریہ حیات، شعبہ تصنیف و تالیف، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۷۹ء، ص ۴۰۵

(۱۶) خالد علوی، ڈاکٹر، اسلام کا معاشرتی نظام، ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۳۱

(۱۸) تجمل حسین ہاشمی، ہمارا معاشرہ، ص ۱۹
(۱۹) اشفاق احمد، زاویہ حصہ دوم، دھرتی کے رشتے، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۸
(۲۰) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵۱۱
(۲۱) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، تو تا کہانی، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۰۴
(۲۲) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، تو تا کہانی، ص ۱۰۳
(۲۳) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، شب خون، ص ۷۸
(۲۴) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، تلاش، ص ۴۱
(۲۵) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، تلاش، ص ۴۲
(۲۶) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، عجیب بادشاہ، ص ۱۱۸
(۲۷) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، بابا، ص ۱۵۵
(۲۸) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، پناہیں، ص ۱۶۵
(۲۹) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، پناہیں، ص ۱۶۷
(۳۰) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، پناہیں، ص ۱۶۸
(۳۱) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، پناہیں، ص ۱۷۰
(۳۲) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، امی، ص ۱۷۸۔۱۷۷
(۳۳) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، امی، ص ۱۹۱
(۳۴) اشفاق احمد، طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن)، سونی، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۸
(۳۵) اشفاق احمد، طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن)، سونی، ص ۲۹
(۳۶) اشفاق احمد، طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن)، سونی، ص ۳۱
(۳۷) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، بندرابن کی کنج گلی میں، ص ۱۲۸
(۳۸) اشفاق احمد، ایک محبت سو افسانے، بندرابن کی کنج گلی میں، ص ۱۳۴
(۳۹) اشفاق احمد، صبحانے فسانے، بدلی سے بدلی تک، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۶۹
(۴۰) نیاز خان، اشفاق احمد کی افسانہ نگاری، منظور شدہ مقالہ (اردو) برائے ایم فل، یونیورسٹی آف پشاور ۲۰۰۸ء ص ۱۸۱

(۴۱)وقار عظیم،سید، پروفیسر،داستان سے افسانے تک،الوقار پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۲ء،ص۳۸۲

(۴۲)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،فہیم،ص۲۱

(۴۳)حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۱۹

(۴۴)حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز، کشاف تنقیدی اصطلاحات،ص۱۲۰

(۴۵)اشفاق احمد، گڈریا(اجلے پھول)،تنکہ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۶۶

(۴۶)اشفاق احمد، گڈریا(اجلے پھول)،تنکہ،ص۷۰

(۴۷)اشفاق احمد، گڈریا(اجلے پھول)،تنکہ،ص۷۱

(۴۸)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،مسرور مرثیہ،ص۱۳۹

(۴۹)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا،ص۲۲۷

(۵۰)القران،،سورۃ النساء، آیت نمبر ۶۶،(مترجم):محمود الحسن،مولانا،تاج کمپنی لمیٹڈ،کراچی، پاکستان،اکتوبر ۲۰۰۲ء

(۵۱)القران،سورۃ الممتحنہ۔آیت نمبر۸

(۵۲)اشفاق احمد،اشفاق احمد کا زاویہ،ٹی اینڈ ٹی پبلشرز،لاہور،ستمبر۲۰۰۵،ص۱۱۳

(۵۳)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،چاند کا سفر،ص۲۷۵

(۵۴)اشفاق احمد،صبحانے فسانے ،چاند کا سفر،ص۲۷۵

(۵۵)شاعر علی شاعر،نیا اردو افسانہ،سٹی بک پوائنٹ اردو بازار،کراچی،۲۰۱۱ء،ص۵۳۱

(۵۶)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،شب خون،ص۷۸

(۵۷)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،رات بیت رہی ہے،ص۳۵

(۵۸)فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات ، پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۰ء،ص۲۰۶

(۵۹)فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات ،ص۲۳

(۶۰)محمد سلمان بھٹی ،''اشفاق احمد پی ٹی وی ڈرامہ اور سماجی حقیقتیں ''،مشمولہ: ''راوی''(اشفاق احمد نمبر)،جلد۹۲،واحد شمارہ،مدیر: ریاض الحسن،اکتوبر ۲۰۰۵ء،گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،لاہور ص۹۷

(۶۱)اشفاق احمد،ایک ہی بولی (پھلکاری)،پھمن کہانی،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۷ء،ص۱۰۴

(۶۲)اشفاق احمد،ایک محبت سو افسانے ،امی،ص۱۷۹

(۶۳)اشفاق احمد،زاویہ (حصہ دوم)،بانسری،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۵ء،ص ۲۰۸

(۶۴)اشفاق احمد،سفر مینا،اٹوٹ مان،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۷ء،ص ۱۴۷

(۶۵)اشفاق احمد،زاویہ (حصہ سوم)،محبت کی حقیقت،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۵ء،ص ۱۲۳

(۶۶)لالہ رخ خان،ایک محبت سو افسانے -تنقیدی جائزہ،منظور شدہ مقالہ برائے ایم اے (اردو)،جامعہ پشاور،۲۰۰۵ء،ص ۲۹

مجموعی جائزہ

''مجموعی جائزہ''

محبت ایک وجدانی کیفیت ہے اس کی حقیقت ادا کرنے سے انسانی دنیا کے الفاظ قاصر ہیں لیکن اس کا مادہ فطری طور پر ہر شخص میں موجود ہے محبت کے ابتدائی درجہ کا ادراک ہر شخص کو حاصل ہے جس کو میلان کہتے ہیں اور اعلیٰ درجہ جس کو عشق کہتے ہیں اس کا ظہور کسی کسی میں ہوتا ہے۔ مگر یہ دولت ہر انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے کیونکہ جب کوئی فرد محبت والوں کے قصے پڑھتا ہے تو دل میں ایک گدگدی سی اٹھتی ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ

اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

یہ محض اس لیے ہوتا ہے کہ انسانوں کے دلوں میں بھی محبت کا مادہ موجود ہے کیونکہ ہر جنس اپنے ہم جنس کی طرف کشش اور میلان رکھتی ہے البتہ اس جوہر کے ظہور کے درجات بے حد ہیں اور اس کے ظاہر ہونے کے مواقع یعنی جہاں یہ دولت سرسبز ہو کر ظاہر ہوتی ہے ان کے مراتب بھی غیر متناہی ہیں۔ لہذا محبت کا جو درجہ اور محبوب کا جو مرتبہ ہوگا اسی کے مطابق محبت کے اثرات مرتب اور ثمرات ظاہر ہوں گے۔

محبت کائنات کا ایک پہلو ہے جس کے بغیر کائنات کا تصور ممکن نہیں۔ محبت ایک جذبہ ہے جو بندہ کو اللہ تعالیٰ سے ملا دیتا ہے۔ محبت معاشرتی معاہدے کا ایک جزو ہے جس پر عمل کرنے والے افراد کامیاب و کامران ہو جاتے ہیں۔ محبت ایک روحانی احساس کا نام ہے جو کسی سے بھی ہو سکتا ہے۔ محبت ایک نفسیاتی تقاضا ہے۔ محبت ازلی جذبہ ہے جس نے وقت اور حالات کے تحت کئی ارتقائی شکلیں اختیار کیں۔ کہیں اسے عشق حقیقی اور کہیں عشق مجازی کہا گیا۔

محبت کا قدیم تصور مادر سری نظام ہے جس میں محبت کا محور محض ''ماں'' کو مانا جاتا تھا۔ اس نظام میں ملکیت ،وراثت، نسبت، حقوق اور فرائض سب کے سب ماں کے رشتے سے وابستہ ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ محبت کا یہ تصور ''پدری نظام'' میں منتقل ہو گیا اور عورت محض ملکیت ہو کر رہ گئی۔ اس تصور محبت میں محبت کا مرکز عورت کی بجائے مرد کو حاصل ہو گیا۔

محبت فطرت ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو رنگ، نسل، مذہب، فرقہ اور عمر سمیت کسی سرحد کی قید قبول نہیں کرتا۔ لفظ محبت کی تعبیر حقیقت میں محبت کے مختلف روپ ہیں۔ یہ وہ روپ ہیں جن سے زندگی میں ہر چاہنے اور چاہے جانے والے کا واسطہ ضرور پڑتا ہے۔

اردو ادب میں رومانویت کا آغاز اگرچہ انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہو چکا تھا تاہم اسے ترقی بیسویں صدی کے پہلی جنگ عظیم کے بعد حاصل ہوا۔ اردو ادب میں رومانویت کی ابتداء سرسید تحریک کے ردعمل کے طور پر ہوئی۔ سرسید نے عقلیت اور مادیت پر بہت زیادہ زور دیا اور فرد کی زندگی کی جذباتی اور رومانی پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ کچھ مدت تک یہ سکہ جاری رہا لیکن بالآخر سرسید کے عقلی اور مقصدی ادب کے خلاف رومانوی ادیبوں نے شدید احتجاج کیا۔

اردو افسانے کا آغاز رومانویت سے ہوتا ہے کیونکہ رومانوی افسانہ چاہے کیسا بھی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب میں افسانے کا آغاز رومانوی افسانہ نگاروں کے ہاتھوں ہو چکا ہے۔ رومانوی افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم سرفہرست ہے۔ رومانویت یلدرم کی شخصیت بھی ہے اور ان کا اسلوب فن بھی۔ اِن کا موضوع عورت اور مرد کی وہ محبت تھی جو فطرت کے قوانین کے علاوہ کسی اور قسم کی رسوم و قیود کی پابند نہ تھی اور اس بات کا ثبوت ان کے افسانوں سے واضح ہے۔

اسی طرح رومانوی افسانہ نگاروں کے صف میں ایک معروف نام نیاز فتح پوری کا ہے۔ نیاز کی نثر میں خیال اور خیال کی مصوری، شوق اور شوق کی تحلیل لفظی، حسن اور حسن کا تاثر سب موجود ہے اور نیاز ایک ایسے رومانوی افسانہ نگار کی صورت میں سامنے آیا جو ہمہ تن جذبہ ہے اور فطرت نے اس پر مہربان ہو کر اس کے ہستی کو اپنی خوبصورتی میں تحلیل کر لیا ہے۔

رومانوی تحریک سے وابستہ افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام قاضی عبدالغفار کا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا مقصد حسن کو اجاگر کرنا ہے جو انسان کی سیرت و کردار میں پوشیدہ ہوتا ہے اور جو سطح پر صرف اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کوئی فرد سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مجنون گورکھپوری کی شخصیت بھی رومانوی افسانہ نگاروں سے وابستہ تھی۔ ان کی رومانویت کا اصل موضوع محبت ہے۔ مگر ان کی محبت کو مختصر وقفہ قرار دے کر اس کے بعد غم والم کو مستقل قرار دیا۔ مجنون گورکھپوری کی رومانویت ماضی سے وابستہ ہے۔

اردو ادب میں حقیقت نگاری اور رومانیت کی تحریکیں ایک لمبے عرصے تک الگ الگ سمت میں سفر کرتی رہیں لیکن جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو یہ دونوں تحریک آپس میں مل گئے اور ۱۹۴۷ء تک انہی دو رجحانات کی بازگشت اردو افسانے میں سنائی دیتی ہے۔ یعنی ۱۹۴۷ء تک جو افسانہ سفر کرتے ہوئے پہنچا وہ رومان اور حقیقت دونوں رجحانات کے ساتھ آیا لیکن اس کی بنیاد زندگی اور اس کے مسائل ہی رہے۔ اس دور کے افسانوں میں رومان کی فضا بھی اس طرح ہے کہ سماج سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اشفاق احمد ایک ادیب، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، تجزیہ نگار اور سفرنامہ نگار کی حیثیت سے ایک عظیم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کی ابتداء سے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھوا اور ان کے اندر موجود داستان گو نے ایک خوبصورت کہانی نگار کا روپ دھار کر اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کیا اور یوں ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کے طور ادب میں اپنا لوہا منوالیا۔

ڈرامہ نگاری کے حوالے سے انہوں نے ایک محبت سو ڈرامے، پھول والوں کی سیر اور من چلے کا سودا جیسے ڈرامے تخلیق کیے اور برصغیر میں پہلی بار آرٹ ڈراموں کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں تصوف اور مابعد الطبیعاتی موضوعات اور عناصر کو جگہ دی۔

اشفاق احمد نے نہ صرف بیک وقت ایک بلند پایہ دانش ور، ادیب، ڈرامہ نگار، براڈ کاسٹر، سفرنامہ نگار، پنجابی شاعر اور افسانہ نگار کا کردار بطریق احسن ادا کیا بلکہ معاشرے کے اندر تہذیبی رویوں، اجتماعی شعور اور لوک دانش کے امین اور تصوف اسلام کے عام فہم شارح بھی تھے۔ اشفاق احمد کی ذات کے عکس در عکس، سطح در سطح اور زاویہ در زاویہ اتنے رنگ ہیں کہ انہیں یکجا کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ ہشت پہلو شخصیت تھے اور ان کا ہر پہلو اپنی جگہ بے حد بھرپور مکمل اور جاندار تھا۔ ان کی عملی وجاہتوں، فکری رفعتوں، روحانی عظمتوں اور ذہنی افق کی وسعتوں کو الفاظ کا جامہ پہنانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔

اشفاق احمد نابغہء عصر تھے۔ وہ دانائے راز تھے، وہ فکر و فن کے ماہ کامل تھے وہ علم و عرفان کے مہر تاباں تھے وہ مشرقی دانش کی علامت تھے وہ زندگی اور امید کے نقیب تھے وہ ایک ناکام معاشرے کے کامیاب انسان تھے وہ صراط مستقیم کے مسافر تھے۔ وہ اپنے معاشرے کا عطر تھے وہ دلوں کے اندر جھانکنے کا فن جانتے تھے۔ وہ نامعلوم کو معلوم میں لانے کے ہنر سے اشنا تھے وہ دلوں میں اتر جانے والی گفتگو اور ذہن و فکر کے دریچوں پر دستک دینے والی تحریر کا سلیقہ جانتے تھے وہ اردو ادب کا ایک روشن باب تھے۔

اشفاق احمد اردو افسانے کا ایک معتبر نام ہے۔ انہوں نے میدان افسانہ میں نت نئے تجربات کیے ہیں اور اس صنف کی نئی راہیں دکھائی ہیں۔ ان کے افسانوں کا تدریجی مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر اپنے ہم عصروں سے دو قدم آگے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے فن افسانہ نگاری کے تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فن اور موضوع کے امتزاج سے افسانے کی صنف میں ندرت اور خوبصورتی پیدا کی۔ ان کا مشاہدہ حیات بے پناہ ہے۔ ان کی یہ باریک بینی ان کے افسانوں میں یوں آراستہ ہوتی ہے کہ افسانے کی پوری فضا زندگی سے چھلکتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔

اشفاق احمد کے ہاں بنیادی اور مرکزی جذبہ ''محبت'' ہے اور اس کے متنوع روپ ہیں جن سے ان کے زیادہ تر افسانے جنم لیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں محبت ایک عظیم کائناتی سچائی کی شکل میں ابھرتی ہے۔انہوں نے انسان سے محبت کا تصور اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کا شہرہ آفاق افسانہ ''گڈریا'' ہے۔اس افسانے کا بنیادی موضوع محبت ہے لیکن یہ محبت کسی خاص بندے سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے محبت ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں شخصی محبت کے حوالے سے عورت سے محبت کا تصور، مرد سے محبت کا تصور، عورت اور مرد کی فطری محبت اور فطرت سے محبت کا تصور مسحور کن انداز میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں مرد، عورت، جوان، بوڑھا، بچے اور جانوروں سے تصور محبت کے مختلف روپ بیان کر کے قاری کو متاثر کیا ہے۔انہوں نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ عورت سے مرد کی اور مرد سے عورت کی محبت کا جذبہ فطری ہے۔اس حوالے سے ''گل ٹریا''''مسکن''، ''شب خون'' اور ''توبہ'' بہترین افسانے ٹھہرائے جاسکتے ہیں۔اسی طرح افسانہ ''خانہ خراب'' میں عورت سے مرد کی محبت کی جھلک نمایاں ہیں ساتھ ساتھ اشفاق احمد نے مرد سے محبت کو بھی اجاگر کیا ہے۔وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے دلوں کی دھڑکن محسوس کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔مرد سے محبت کے تصور کو انہوں نے افسانہ ''دکھودکھ'' میں انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔انہوں نے اس افسانے میں ''ریحانہ'' جیسے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ انسان کبھی بھی اپنی پہلی محبت کو فراموش نہیں کرسکتا۔اس کے علاوہ مرد سے محبت کے حوالے سے ''بابا''، ''توتا کہانی'' اور ''برکھا'' جیسے افسانے بہترین افسانے قرار دیے جاسکتے ہیں۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں محبت کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی ہیں۔ان میں ایک پہلو فطرت سے محبت کا تصور بھی ہے چونکہ فطرت سے محبت ہر انسان کی گھٹی میں پڑی ہے اس لیے اشفاق احمد نے اس موضوع کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔اس سلسلے میں ان کا خوبصورت افسانہ ''فہیم'' ہے جس میں بارش کے برسنے، برساتی نالوں کا شور، بجلی کی کڑک اور پہاڑوں کی چوٹی جیسے خوبصورت اور دلکش مناظر پیش کر کے فطرت سے لگاؤ اور محبت کا جذبہ ابھارا گیا ہے۔اسی طرح افسانہ ''توتا کہانی'' کا آغاز خوبصورت قدرتی مناظر سے کیا گیا ہے اور افسانہ ''بندر لوگ'' میں کشمیر کی قدرتی خوبصورتی اور دلکشی کو انتہائی خوبصورت انداز میں پیرائے میں لایا ہے۔اشفاق احمد کے ہاں فطرت سے محبت کا احساس افسانہ ''بابا'' میں بھی نظر آتا ہے۔اس افسانے میں اشفاق احمد نے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی اصل خوبصورتی کو روح سے محسوس کرنے اور خدا کے نزدیک ہونے کا ذریعہ صرف اور صرف فطرت ہے۔

انسانی جذبات میں سب سے زیادہ طوفانی جذبہ ''جنسی جذبہ'' ہے۔اس لیے سب سے زیادہ اسی جذبے کی تنظیم کی ضرورت محسوس کی گئی۔جنس سے محبت کے بارے میں اشفاق احمد نے ادب سے تعلق رکھنے والے دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ راستہ اختیار کیا ہے۔ان کے ہاں محبت ماورائی نہیں بلکہ روحانی ہے اور جسمانی قرب سے جلا

پاتی ہے لیکن یہ جسمانی تعلق کبھی بھی لچر پن کی حدود سے تجاوز کرتا دکھائی نہیں دیتا۔جنس سے محبت ان کے ہاں شجر ممنوعہ نہیں ہے اور نہ ہی شرمانے کی بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ وسیلہ لذت اور سطحی جذبائیت اور سفلی جذبات پیدا کرنے کا الہ بھی نہیں ہے جنس سے محبت کے حوالے سے ''عجیب بادشاہ'' بندرابن کی کنج گلی میں'' اور ''تنکہ'' جیسے افسانے بہت اہم ہیں۔

اشفاق احمد جنس سے محبت کے قائل افسانہ نگار ہیں لیکن جنس زدگی اور جنسی ہوس کے سخت خلاف ہیں۔یہ تصور افسانہ ''بندر لوگ'' میں موجود ہے۔اس افسانے میں انہوں نے بندروں کے ذریعے ان خصلتوں کو بے نقاب کیا ہیں جو بعض حیوان صفت انسانوں میں پائے جاتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں جسمانی اور روحانی محبت کا تصور نمایاں نظر آتا ہے۔انہوں نے جسمانی محبت کے جذبات سے کہیں زیادہ روحانی محبت کے تقاضے پورے کیے ہیں۔چونکہ اشفاق احمد روحانیت کے استاد تھے اس لیے انہوں نے اپنے افسانوں میں روحانی محبت کے تقاضوں کو اسلامی تعلیمات کی رنگ میں رنگا ہیں۔روحانی محبت کا تصور افسانہ ''رات بیت رہی ہے''، ''گڈریا'' اور افسانہ ''فہیم'' میں بے حد خوبصورت پیرائے میں بیان کیا ہیں ۔اسی طرح ان کے افسانوں میں جسمانی محبت کے نمونے بھی ملتے ہیں کیونکہ دراصل ان کے فلسفہ حیات کا مرکز محبت ہے اس سلسلے میں افسانہ ''امی'' اور افسانہ ''بابا'' میں جسمانی محبت کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔

اشفاق احمد نے محبت کا کوئی بھی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔انہوں نے اپنے افسانوں میں معصوم بچوں اور پالتو جانوروں کے لیے بھی محبت کا ایک دریچہ کھل رکھا ہے۔''فہیم''، ''تلاش''، ''گاتو''، پناہیں'' اور گل ٹریا'' ان افسانوں کی صف میں شامل ہیں جن میں معصوم بچوں اور پالتو جانوروں سے محبت و ہمدردی نمایاں ہیں۔

اردو نثر سے تصوف کی وابستگی کا مقصد معاشرتی اصلاح، باہمی محبت اور اخلاقی اقدار کی اشاعت ہے تاکہ لوگوں کے سماجی تعلقات عمدہ بنیادوں پر استوار ہوں۔اشفاق احمد کے ہاں ابتداء سے ہی تصوف کے اثرات ملتے ہیں۔اس بات کی تصدیق ان کے چھ افسانوی مجموعوں اور دوسری نثری تحریروں سے ہوتی ہے کہ تصوف ان کی گھٹی میں شروع ہی سے موجود رہا ہے اور ان کا پیغام بندوں کا اللہ تعالیٰ سے اور بندوں کا آپس میں محبت اور تعلق کو برقرار رکھنا ہے۔

اشفاق احمد تصوف پسند افسانہ نگار تھے۔تصوف کی طرف راغب ہونے کا اعتراف ان کی تحریر و تقریر سے ثابت ہے۔ان کے افسانوں میں محبت اور تصوف کا امتزاج پایا جاتا ہے۔اس امتزاج میں کہیں رومانویت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے تو کہیں تصوف کا۔ان کے شہرہ آفاق افسانہ ''گڈریا'' میں محبت اور تصوف کا بہترین امتزاج ملتا ہے ۔اگرچہ اس افسانے کا مرکزی موضوع محبت ہے لیکن محبت کے ساتھ ساتھ تصوف کی آمیزش پوری طرح عیاں ہے۔

اشفاق احمد کا تصوف کی پر خار وادی میں آنے کا مقصد دانش وحکمت کی تلاش ہے۔ان کے نزدیک اللہ والے بندے ہمیشہ دنیا سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔کسی دور پہاڑی یا ویرانے میں جا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں یکسوئی سے دن رات مشغول رہتے ہیں اور آخرت کے لیے توشہ تیار کرتے ہیں۔ان کے افسانے ''خود بدولت''، ''رکی ہوئی عمر''، ''گڈریا''، ''اور فہیم'' جیسے افسانے محبت اور تصوف پر مبنی ہے۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں محبت اور تصوف کے حوالے سے ایک گوشہ بابوں کے کشف وکرامات اور ان سے عقیدت ومحبت کا ہے۔وہ بابوں کے بے حد عقیدت مند تھے کیونکہ وہ اکثر بابوں کی تلاش میں رہتے تھے۔انہوں نے لوگوں کے لیے بابوں کی نشانیاں بھی بتائی ہیں اور بابوں کی تعریفیں بھی بیان کی ہیں۔ان کے ہاں بابا وہ شخص ہوتا ہے جو دوسرے انسان کو آسانی عطا کرے۔

تصوف نہ صرف خود کو سنوارنے کا نام ہے بلکہ دوسروں کے ساتھ بہتر رویے کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد فرد اور معاشرے کے تعلق کو بہتر بنانے کے لیے اخلاقی اقدار کو اپنانے کی بات کرتے ہیں اور انہی روایات سے رشتہ مضبوط رکھنے پر زور دیتے ہیں اور اسی پر ان کے تصوف کی بنیاد ہے۔وہ نہ صرف انسان کو دنیا وآخرت کے تعلق کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں بلکہ انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے نجات دلاتے ہیں۔

سماج انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔انسانوں کا باہمی مل جل کر زندگی گزارنے کا نام معاشرہ ہے کیونکہ انسان کو اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے دوسرے لوگوں سے وابستہ رہنا پڑتا ہے چونکہ محبت انسان کی گھٹی میں پڑی ہے اس لیے سماج اور محبت کا آپس میں گہرا رشتہ اور تعلق ہے۔

اشفاق احمد نے اپنے افسانوں میں سماج اور محبت کا باہمی اظہار کیا ہے۔وہ ایک ایسے سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جس میں ہر طرف محبت ہی محبت نظر آتی ہو۔ان کے ہاں محبت کا سماجی اظہار بہت وسیع اور لامحدود ہے۔وہ نہ صرف ایک خطہ زمین کے باشندوں کے رہن سہن کی بات کرتے ہیں۔بلکہ وہ بین الاقوامی سطح پر بلا تخصیص مذہب وقوم کے انسان کی فلاح وبہبود کا پیغام دیتے ہیں۔

اشفاق احمد نے سماج اور محبت کا باہمی تعلق اور انسان وسماج کا آپس میں رشتہ کو ''دھرتی کے رشتے''، ''توتا کہانی''، ''شب خون'' اور ''تلاش'' جیسے افسانوں میں ذکر کیا ہیں۔

اشفاق احمد کو سماج کی ہر چیز اور ہر ایک مذہب سے محبت ہیں۔وہ اس وسیع معاشرے میں امن امان اور محبت کی قندیل روشن کرنا چاہتے ہیں۔ساتھ ساتھ انہوں نے معاشرتی برائیوں کی بھی نشان دہی کی ہیں بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے اشفاق احمد نے ان برائیوں کی بیخ کنی کی کوششوں کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہیں۔افسانہ ''عجیب بادشاہ'' میں چوری کے واردات ،افسانہ ''بابا'' میں ''ایلن'' کے ساتھ ہسپتال میں ڈاکٹر اور نرسوں کا ظالمانہ

اور گستاخانہ رویہ اور افسانہ ''پناہیں'' میں چھوٹے اور معصوم بچوں پر ظلم وتشدد جیسے معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا ہیں۔

اشفاق احمد ترقی پسند تحریک سے منسلک ادیب نہیں تھے۔ پھر بھی انہوں نے محنت کشوں کی حق تلفی کے المیے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور طبقاتی شعور کا اظہار کیا۔ انہوں نے پنے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی انہوں نے افسانہ ''تنکہ'' میں یہ بات واضح کی ہے۔ کہ سماج میں ان لوگوں کی عزت واحترام کی جاتی ہے جن کے پاس مال ودولت کی فراوانی ہوتی ہے اور غریب لوگوں کی معاشرے میں کوئی وقعت اور value نہیں ہوتی۔

اسی طرح انہوں نے افسانہ ''مسرور مرثیہ'' میں معاشرہ میں ہاتھ سے کام کرنے والے محنت کشوں اور کاریگروں کی حق تلفی کا رونا رویا ہے اور یہ سمجھانے اور بتانے کی سعی کی ہے کہ کس طرح اعلیٰ طبقے کے لوگ ہاتھ سے کام کرنیوالے سادہ لوح لوگوں کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر انہیں سماج کے نچلے طبقے میں دھکیل دیتے ہیں۔ افسانہ ''قصہ شاہ مراد اور ایک احمق چڑیا کا'' میں بھی طبقاتی جبر کو کھلے طور پر بیان کیا ہیں۔

اشفاق احمد ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک افسانہ نگار تھے۔ انہوں نے محبت کے ساتھ ساتھ سماج میں مختلف قسم کے مسائل اور الجھنوں کا بیان کیا ہیں۔ انہوں نے سماجی مسائل کی نشاندہی کر کے ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ افسانہ ''پھمن کہانی'' میں معاشرتی مسائل اور غریب کی مجبور زندگی کے کئی رخ دکھائے ہیں۔ افسانہ ''امی'' اشفاق احمد کا ایک حقیقت پسندانہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جن بچوں کے ماں باپ دوسری شادی کر لیتے ہیں ان کو کن مسائل اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بچوں کی ذہنی نشوونما کس حد تک متاثر ہوتی ہے افسانہ ''اٹوٹ مان'' میں خود پسندی اور نرگسیت کی وجہ سے ذہنی امراض کا شکار ہونے والے افراد کی نشاندہی کی ہے۔

مآخذ و مصادر

کتابیات

بنیادی مآخذ:

۱۔اشفاق احمد ،ایک محبت سو افسانے ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۱۳ء

۲۔اشفاق احمد ،اجلے پھول ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور۲۰۱۲ء

۳۔اشفاق احمد ،سفر مینا،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہو،ر۲۰۰۷ء

۴۔اشفاق احمد ،صبحانے فسانے ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور۲۰۱۲ء

۵۔اشفاق احمد ،طلسم ہوش افزا (سائنس فکشن)،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۱۳ء

۶۔اشفاق احمد،پھلکاری ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۰۷ء

۷۔اشفاق احمد،سفر درسفر ،غالب پبلیشرز ،لاہور،۱۹۸۱ء

۸۔اشفاق احمد ،میرا وطن میرا پاکستان،برق سنز لمیٹڈ،اسلام آباد،س ن

۹۔اشفاق احمد ،ایک محبت سو ڈرامے ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۱۹۸۸ء

۱۰۔اشفاق احمد ،حیرت کدہ ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۱۹۹۵ء

۱۱۔اشفاق احمد ،مہمان سرائے ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۱۹۹۶ء

۱۲۔اشفاق احمد ، توتا کہانی ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۱۹۹۸ء

۱۳۔اشفاق احمد ،من چلے کا سودا ،القمر،لاہور،۱۹۹۹ء

۱۴۔اشفاق احمد ،شاہلا کوٹ ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۰۱ء

۱۵۔اشفاق احمد ،شورا شوری ،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور۲۰۰۶ء

۱۶۔اشفاق احمد، زاویہ ،حصہ اول،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۰۴ء

۱۷۔اشفاق احمد ،زاویہ ،حصہ دوم،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۰۵ء

۱۸۔اشفاق احمد ، زاویہ، حصہ سوم،سنگ میل پبلی کشنز ،لاہور،۲۰۰۵ء

ثانوی مآخذ

۱۔القران،(مترجم):محمودالحسن،مولانا،تاج کمپنی لمیٹڈ،کراچی،پاکستان،اکتوبر۲۰۰۲ء

۲۔احتشام ربانی،رانا،داستان اور معاشرہ ،جمہوری پبلی کشنز،لاہور،جون۲۰۱۰ء

۳۔اعزازاحمدآذر ،زمانہ بڑے شوق سے سن رہاتھا (اشفاق احمد)،خالد بک ڈپو،لاہور۲۰۰۴ء

۴۔امجد طفیل ،قرۃ العین حیدر ۔تشخص کی تلاش میں ،پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ،لاہور ۱۹۹۱ء

۵۔انتظارحسین ،ملاقاتیں ،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۸۸ء

۶۔انوراحمد،ڈاکٹر ،اردو افسانہ تحقیق و تنقید ، بیکن ہاؤس گل گشت،ملتان،۱۹۸۸ء

۷۔انورسدید،ڈاکٹر ،اردو ادب کی تحریکیں ، انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۱۹۹۶ء

۸۔انورسدید،ڈاکٹر ،مختصر اردو افسانہ ۔عہد بہ عہد ،مقبول اکادمی،لاہور،۱۹۹۲ء

۹۔اے حمید ،اشفاق احمد ۔شخصیت وفن،اکادمی ادبیات،اسلام آباد،۱۹۹۸ء

۱۰۔اے حمید ،داستان گو (اشفاق احمد) ، سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۱۹۹۶ء

۱۱۔ایرک فرام،صحت مند معاشرہ،(مترجم): قاضی جاوید،انتخاب جدید پریس،لاہور،۱۹۹۱ء

۱۲۔ایم سکاٹ پیک ،محبت کی نفسیات ،(مترجم):یاسر جواد،تخلیقات،لاہور،۱۹۹۸ء

۱۳۔بانوقدسیہ ،راہ رواں ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۱۱ء

۱۴۔بانوقدسیہ ، کچھ اور نہیں،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۴ء

۱۵۔پروین اظہر،ڈاکٹر ،اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ ،طبع اول،۲۰۰۰ء

۱۶۔تجمل حسین ہاشمی ،ہمارا معاشرہ ،ابلاغ پبلشرز اردو بازار،لاہور،۲۰۰۱ء

۱۷۔حفیظ صدیقی،ابوالاعجاز،کشاف تنقیدی اصطلاحات ،مقتدرہ قومی زبان،اسلام آباد،پاکستان ۱۹۸۵ء

۱۸۔خالدعلوی،ڈاکٹر ،اسلام کا معاشرتی نظام ،ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ،لاہور،۱۹۶۸ء

۱۹۔خورشیداحمد ، اسلامی نظریہ حیات ،شعبہ تصنیف وتالیف،کراچی یونیورسٹی،۱۹۷۹ء

۲۰۔رشیداحمد،پروفیسر ،مسلمانوں کے سیاسی افکار،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۱۹۸۶ء

۲۱۔روسو، معاہدہ عمرانی ، (مترجم):محمود حسین،تصنیف وتالیف،کراچی یونیورسٹی،۱۹۶۴ء
۲۲۔رئیس امروہوی،جنسیات ،ویلکم بک پورٹ اردو بازار،کراچی،۲۰۱۳ء
۲۳۔ریاض محمود،داستان گو،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۴ء
۲۴۔سلیم آغا قزلباش ،جدید اردو افسانے کے رجحانات،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۲۰۰۰ء
۲۵۔سلیم اختر،ڈاکٹر،اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۸ء
۲۶۔سلیم اختر،ڈاکٹر،عورت ،جنس اور جذبات ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۱۹۹۶ء
۲۷۔سلیم اختر،ڈاکٹر ،مغرب میں نفسیاتی تنقید ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۱۹۹۸ء
۲۸۔سلیم فیڈرک ،معاشرہ (سوسائٹی)،(مترجم):رفیع احمد،القاضی،نئی دہلی،۲۰۰۳ء
۲۹۔سمیر حلبی،محبت کی حقیقت،المکتبہ رحمانیہ،لاہور،۲۰۰۷ء
۳۰۔سہیل احمد خان،ڈاکٹر ،منتخب ادبی اصطلاحات ،شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی،لاہور،۲۰۰۵ء
۳۱۔سید عبداللہ،ڈاکٹر ،مباحث،مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۶۵ء
۳۲۔سید وقار عظیم،پروفیسر ،داستان سے افسانے تک ،الوقار پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۲ء
۳۳۔سید وقار عظیم،پروفیسر ،نیا افسانہ ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۹۰ء
۳۴۔سی۔اے۔قادر،ڈاکٹر ،کارل مارکس اور اس کی تعلیمات ،(تدوین):طارق عزیز،ڈاکٹر ،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہور،۱۹۸۸ء
۳۵۔شاعر علی شاعر ،نیا اردو افسانہ ،سٹی بک پوائنٹ اردو بازار،کراچی،۲۰۱۱ء
۳۶۔شعیب عتیق،ڈاکٹر ،اردو افسانوی ادب پر فسادات ۱۹۴۷ء کے اثرات ،بیکن بکس، لاہور،۲۰۰۴ء
۳۷۔شفیق انجم،ڈاکٹر ،اردو افسانہ ،پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۰۸ء
۳۸۔شیما مجید ،ادبی مذاکرے ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۱۹۸۹ء
۳۹۔صلاح الدین درویش،اردو افسانے کے جنسی رجحانات ،نگارشات میاں چیمبر ٹمبل، لاہور،۱۹۹۹ء
۴۰۔ظہیر احمد صدیقی،ڈاکٹر،تصوف اور تصورات صوفیہ،سٹی بکس،لاہور،۲۰۰۸ء
۴۱۔ظہیر احمد صدیقی،ڈاکٹر،تصوف ہر انسان کی ضرورت،تخلیقات،علی پلازہ مزنگ روڈ،لاہور،۲۰۱۰ء

۴۲۔عبادت بریلوی،ڈاکٹر، افسانہ اور افسانے کی تنقید ،ناظم ادارہ ادب وتنقید،لاہور،۱۹۸۶ء
۴۳۔عبدالوکیل،ابوعلی،اشفاق ۔داستان سرائے کا مسافر ،علم وعرفان پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۴ء
۴۴۔علی عباس جلالپوری،تاریخ کا نیا موڑ ،تخلیقات،لاہور،۲۰۱۰ء
۴۵۔علی عباس جلالپوری ،جنسیاتی مطالعے ،تخلیقات،لاہور،۲۰۰۷ء
۴۶۔علی عباس جلالپوری،خردنامہ جلالپوری ،تخلیقات،لاہور،۲۰۰۶ء
۴۷۔غلام حسین،اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ ،منظورشدہ مقالہ پی ایچ ڈی (اردو)،شعبہ اردو،سندھ یونیورسٹی،۱۹۷۵ء
۴۸۔فردوس انور قاضی،ڈاکٹر،اردو افسانہ نگاری کے رجحانات ،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۹۰ء
۴۹۔فرمان فتح پوری،ڈاکٹر،اردوافسانہ اور افسانہ نگار ،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۸۴ء
۵۰۔فوزیہ اسلم،ڈاکٹر،اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات ،پورب اکادمی اسلام آباد ،۲۰۱۰ء
۵۱۔گوپی چند نارنگ،اردو افسانہ روایت اور مسائل ،سنگ میل پبلی کشنز،لاہور،۲۰۰۲ء
۵۱۲۔لالہ رخ خان،ایک محبت سو افسانے ۔تنقیدی جائزہ،منظورشدہ مقالہ برائے ایم اے (اردو)،جامعہ پشاور،۲۰۰۵ء
۵۳۔مبارک علی،ڈاکٹر ،تاریخ اور عورت ،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۰۵ء
۵۴۔محمد اجمل،ڈاکٹر ،مقالات اجمل،علم وعرفان پبلشرز،لاہور،۲۰۰۰ء
۵۵۔محمد اقبال،محبت،مکتبہ الشیخ بہادر آباد،کراچی،س ن
۵۶۔محمد حفیظ الرحمٰن،ڈاکٹر ،تصوف اور صوفیاء کی تاریخ ،سیونتھ سکائی پبلی کشنز،لاہور،۲۰۱۴ء
۵۷۔محمد خان اشرف،ڈاکٹر ،رومانویت اور اردو ادب میں رومانوی تحریک ،الوقار پبلی کشنز ،لاہور،۱۹۹۸ء
۵۸۔محمد شاہ،اشفاق احمد ۔بے نیاز صوفی بابا،علم دوست پبلی کشنز،لاہور،۲۰۱۱ء
۵۹۔محمد عالم خان،ڈاکٹر ،اردو افسانے میں رومانوی رجحانات ،علم وعرفان پبلشرز،لاہور،۱۹۹۸ء
۶۰۔ممتاز احمد خان،ڈاکٹر، اردو ناول کے بدلتے تناظر،ویلکم بک پورٹ،کراچی،۱۹۹۳ء
۶۱۔ممتاز مفتی،اور اوکھے لوگ ،فیروز سنز،لاہور،۱۹۹۱ء

۶۲۔نجیبہ عارف،ڈاکٹر ،ممتاز مفتی کا فکری ارتقاء ،الفیصل اردو بازار،لاہور،۲۰۱۱ء
۶۳۔نذیر احمد ،فکشن نگار ممتاز مفتی،دستاویز مطبوعات،لاہور،۱۹۹۶ء
۶۴۔نعیم احمد،ڈاکٹر ،رسل کے مضامین ،(مترجم): قاضی جاوید،آر بی 5،نیو گارڈن ٹاون،لاہور،س ن
۶۵۔نگہت ریحانہ خان ، اردو مختصر افسانہ مطالعہ ۱۹۴۷ء کے بعد ،ایجوکیشنل پبلشنگ،دہلی، ۱۹۸۶ء
۶۶۔نگہت ریحانہ خان ،اردو مختصر افسانہ فنی وتکنیکی مطالعہ ۱۹۴۷ء کے بعد ، بک وائز ،لاہور،۱۹۸۸ء
۶۷۔نیاز خان،اشفاق احمد کی افسانہ نگاری ،منظور شدہ مقالہ برائے ایم فل (اردو) جامعہ پشاور ،۲۰۰۸ء
۶۸۔وزیر آغا،ڈاکٹر ،اردو شاعری کا مزاج ،مکتبہ عالیہ ایبک روڈ،لاہور،۱۹۷۸ء
۶۹۔وزیر آغا،ڈاکٹر،مسرت کی تلاش،اظہار سنز پرنٹرز،لاہور،۲۰۱۲ء
۷۰۔ول ڈیورنٹ،نشاط فلسفہ ،(مترجم):محمد اجمل،فکشن ہاؤس،لاہور،۱۹۹۵ء

لغات/انسائیکلو پیڈیا

۱۔احمد دہلوی،سید،فرہنگ آصفیہ،مکتبہ حسن سہیل لمٹیڈ،لاہور،۱۹۷۴ء
۲۔ اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا ،اردو سائنس بورڈ،۲۰۰۷ء
۳۔حفیظ صدیقی ابوالاعجاز،''کشاف تنقیدی اصطلاحات''،مقتدرہ قومی ادارہ پاکستان،اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
۴۔رشمی چودھری،مختصر اردو لغت،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۰۹ء
۵۔شاذیہ افتخار خان، اردو انسائیکلو پیڈیا،فیروز سنز،لاہور،چوتھا ایڈیشن،۲۰۰۵ء
۶۔شان الحق حقی،فرہنگ تلفظ،مقتدرہ قومی زبان پاکستان،اسلام آباد،۲۰۰۲ء
۷۔عبدالکریم،ابوالقاسم،امام ،تصوف کا انسائیکلو پیڈیا ،(مترجم):محمد عبدالنصیر بن عبدالبصیر،مکتبہ رحمانیہ لاہور،س ن
۸۔فیروز الدین،مولوی،فیروز الغات اردو ،فیروز سنز لمٹیڈ،لاہور،۱۹۸۳ء

۹۔ فیروز اللغات اردو (جامع) ، فیروز سنز، لاہور، ۲۰۱۱ء
۱۰۔ محبوب عالم، مولوی، اسلامی انسائیکلو پیڈ یا، الفیصل اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۵ء
۱۱۔ نورالحسن نیر، مولوی ، نور اللغات ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

رسائل:۔

۱۔ ''ادب لطیف''، شمارہ ۱۵، مدیر: صدیقہ بیگم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۲۰۰۴ء
۲۔ ''ادب لطیف'' اشفاق احمد نمبر، شمارہ ۵، جلد نمبر ۷۰، مدیر: صدیقہ بیگم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، مئی ۲۰۰۵ء
۳۔ ''ادبیات'' سہ ماہی، شمارہ ۹۷، مدیر: محمد عاصم بٹ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
۴۔ ''اوراق''، افسانہ انشائیہ نمبر، مدیر: وزیر آغا، جدید ناشرین چوک اردو بازار، لاہور، ۱۹۷۲ء
۵۔ ''اوراق''، افسانہ نمبر، مدیر: وزیر آغا، جدید ناشرین چوک اردو بازار، لاہور، جنوری، فروری ۱۹۷۷ء
۶۔ ''بازیافت'' شمارہ نمبر ۱۱، مدیر: محمد کامران، شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی، لاہور، جولائی ۲۰۰۷ء
۷۔ ''ٹی ۔وی ٹمپو'' ماہنامہ، مدیر:، کراچی، جولائی ۱۹۸۶ء
۸۔ ''خیابان'' ششماہی، شمارہ ۲۳، مدیر: فقیر اخان فقری، شعبہ اردو جامعہ پشاور، خزان، ۲۰۱۰ء
۹۔ ''دریافت''، شمارہ ۱۲، مدیران: روبینہ شہناز، شفیق انجم، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۳ء
۱۰۔ ''راوی'' (اشفاق احمد نمبر)، واحد شمارہ، جلد ۹۲، مدیر: ریاض الحسن، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، اکتوبر ۲۰۰۵ء
۱۱۔ ''نقوش''، افسانہ نمبر، مدیر: محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو، لاہور، جولائی ۱۹۵۲ء

اردو اخبارات:۔

۱۔ اخبار جہاں، ہفتہ روزہ، کراچی، ۲۰۔۔۔۔۲۶ ستمبر ۲۰۰۴ء
۲۔ انصاف، روزنامہ، لاہور، ۸ ستمبر ۲۰۰۴ء
۳۔ انصاف، روزنامہ، لاہور ، ۱۶ ستمبر ۲۰۰۴ء
۴۔ اوصاف، روزنامہ، اسلام آباد، ۱۳ ستمبر ۲۰۰۴ء
۵۔ ایکسپریس، روزنامہ، لاہور ۱۰ ستمبر ۲۰۰۴ء

۶۔ پاکستان، روزنامہ (ہفت روزہ تصویر پاکستان)، ۲۸ اگست ۱۹۹۲ء

۷۔ جسارت، روزنامہ کراچی، ۹ ستمبر ۲۰۰۴ء

۸۔ جنگ روزنامہ، جمعہ میگزین، ۱۰ اپریل ۱۹۹۲ء

English Books and Dictionaries :.

1.A Modren Short Story By H.E Bates.

2. Bryans Turner"The Cambridge Dictionary of sociology "Cambridge University Press ,2006.

3. Khalid Mahmood "Religion in Theory ",Lahore Moazza Press1989.

4. Oxford Dictionary oxford ,vol,2 ,Bay Books 1978

5. "The Blackwell Dictionary of twentieth Century Social Thought "UK Blackwell Publishers ,1993

Internet Material

1.http:// Ashfaqahmed .com

2. http://AshfaqAhmedabout Pakistan and Quaid

3. http:// bbcurdu.com